امام اہل سنت حضرت مولانا عبد الشکور فاروقی لکھنوی رحمہ اللہ

اور ان کی تحریک مدح صحابہ رضی اللہ عنہم اور اس کے اثرات

از

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مرتب

ابو الحسن علی فاروقی



امامِ اہلِ سنت حضرت مولانا عبد الشکور فاروقی لکھنوی رحمہ اللہ

اور اُن کی تحریک مدحِ صحابہ رضی اللہ عنہم

اور اس کے اثرات

از

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مرتب

ابو الحسن علی فاروقی

محمود پبلی کیشنز اسلامک ٹرسٹ

جامعہ ملیہ اسلامیہ محمود کالونی، شاہدرہ، لاہور

نام کتاب: امام اہل سنت سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنویؒ
اوران کی تحریک مدح صحابہؓ اوراس کے اثرات
ازمفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

مرتب ابوالحسن علی فاروقی (farooquiali11@gmail.com)

سن اشاعت: ۱۴۴۲ھ مطابق ۲۰۲۱ء

صفحات : ۱۵۶

تعداد ۱۱۰۰

قیمت

کمپوزنگ: عبدالکریم ندوی (+91-9452125145)

ملنے کے پتے:

۱- مکتبہ فاروقیہ، ۲۲۰/۵۰، دریائی ٹولہ، پاٹانالہ، لکھنؤ
۲- مکتبہ اسلام، گوئن روڈ، لکھنؤ
۳- الفرقان بکڈپو، نظیرآباد، لکھنؤ
۴- مکتبہ احسان، ندوہ روڈ، لکھنؤ
۵- مجلس تحقیقات ونشریات، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

Abdul Aleem Farooqui

President, All India Majlis-e-Tahaffuz-e-Namoos-e-Sahaba
Principal, Darul Mubaligheen Lucknow
Ameer-e-Shariat, Uttar Pradesh
Member, Majlis-e-Shoora Darul Uloom Deoband
Member, Majlis-e-Shoora Darul Uloom Nadwatul Ulama Lko
Vice President, Jamiat Ulama-e-Hind
Chairman, Deeni Taleemi Trust Lucknow

عبدالعليم الفاروقي

رئيس مجلس الصيانة لحرمة الصحابة لعموم الهند
مدير دار المبلغين ، لكناؤ
أمير الشريعة بولاية أترابراديش ، الهند
عضو المجلس الاستشاري بدار العلوم ديوبند
عضو المجلس الاستشاري بدار العلوم ندوة العلماء ، لكناؤ
نائب رئيس جمعية علماء الهند
رئيس وقف التعليم الاسلامي ، لكناؤ

Residence 207/49 Chaudhry Garahiya, Lucknow-226003 Mob +91-9415583014, +91-8887543080 Email abdulaleemfaruqui@gmail.com

Ref . . . .

Date ....

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

گرامی قدر جناب مولانا ثقلین جاوید صاحب زید حبکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ابھی حال میں شائع ہونے والی ہماری دو مطبوعات کے سلسلہ میں آپ کا پیغام ملا کہ آپ اپنے یہاں ان کو شائع کرنا چاہتے ہیں، موضوع سے آپ کی مناسبت اور علامہ ڈاکٹر خالد محمود صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کے نیازمندانہ تعلق اور عقیدت ومحبت اور ان کے زیر تربیت علمی کاموں میں مشغولیت کے پیش نظر ہم آپ کو درج ذیل دونوں کتابوں کو شائع کرنے کی اجازت دیتے ہیں۔

(۱) حضرت سیدنا امیر معاویہ رضی اللہ عنہ اور معاندین کے اعتراضات
مؤلف: (مولانا) عبدالعلیم فاروقی

(۲) امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ اور ان کی تحریک مدح صحابہؓ اور اس کے اثرات
از: مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ / مرتب: ابوالحسن علی فاروقی

(مولانا) عبدالعلیم فاروقی

۲۱ / رمضان / ۱۴۴۲ھ مطابق ۴ / مئی / ۲۰۲۱ء

اللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

اللّٰھُمَّ بَارِکْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ

کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ

اِنَّکَ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ

فہرست

امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنویؒ
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ
کی تحریروں میں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

از: مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم

(ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد المرسلين وخاتم النبين محمد وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين وبعد:

لکھنؤ میں دو صدی سے زائد عرصہ پہلے سے رفض و شیعیت کی ترویج و تقویت کے لئے کام ہو رہا تھا اور اس میں خاص طور پر نصیر آباد اور رائے بریلی کے بعض شیعہ علماء کی سرپرستی حاصل تھی جن میں دلدار علی نصیر آبادی کا نام زیادہ نمایاں تھا، اور زیادہ مدد حکومت سے مل رہی تھی، جس سے یہاں شیعیت کی ترویج اور اشاعت ہو رہی تھی، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے لکھنؤ و نصیر آباد میں رفض و شیعیت کے مقابلہ کے لئے عملی جد و جہد کا نمونہ پیش کیا، اور بڑی اصلاح ہوئی، اپنی جماعت کے ساتھ لکھنؤ کے دورہ و قیام میں اصلاحی و دعوتی جد و جہد جاری رکھی، جہاں ان کا قیام ٹیلہ والی مسجد میں رہا تھا، اور ان کے ساتھ حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید اور دوسرے علماء بھی تھے، مولانا عبدالحی بڈھانوی کے ہر درس میں دو چار اہل تشیع ضرور توبہ کر کے اہل سنت والجماعت میں داخل ہوتے تھے،

نواب معتمد الدولہ کو شکایت پہنچی تو انہوں نے جنگ کی دھمکی دی، تو حضرت سید صاحب نے کہلوایا وعظ وارشاد ہماری ذمہ داری ہے، مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا، اللہ میرا مددگار ہے، اور پھر معتمد الدولہ آغا میر کو جا کر حضرت سید صاحب نے خود نصیحت کی اور برے اعمال اور ظلم وجور سے توبہ کرائی، معتمد الدولہ آغا میر نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق کچھ سوالات کیے، مگر حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے سیر حاصل بیان کے بعد وہ اور سبھی اہل تشیع خاموش ہوگئے اور کچھ بن نہ پڑا، اور مولانا عبدالحی بڑھانوی نے ان کی ایک مجلس میں موثر وعظ کیا، حاکم اودھ نواب غازی الدین حیدر (سنہ جلوس ۱۲۲۹ھ) نے بھی ملنا چاہا مگر ان کے درباری مانع بن گئے، ورنہ نقشہ ہی کچھ اور ہوتا، یہ ۱۲۳۴ھ کی بات ہے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ پھر دوسرے اصلاحی، دعوتی دوروں اور تربیت وتزکیہ وارشاد کے عمل میں لگ گئے اور اس رخ کی سرپرستی اختیار کی اور ان کا دائرہ اصلاح ودعوت صرف رائے بریلی اور لکھنؤ اور اس کے مضافات نہ رہے، پورا برصغیر ان کا اور ان کے خلفاء کا مرکز عمل بن گیا، اور رائے بریلی سے متصل مقام ہسوہ فتحپور میں جہاں ان کی عزیزداری تھی، ان کے ایک ممتاز مسترشد مولانا سید سراج الدین ہسوی (جد مادری مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء) تھے جو حضرت مولانا شاہ سید عبدالسلام ہسوی (متوفی ۱۲۹۹ھ) کے مربی اور حقیقی چچا اور خسر بھی تھے، حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ہسوی کے رد رفض وشیعیت پر مفید رسائل بھی ہیں جیسے تذکرۂ اثناعشریہ اور تفضیح الشیعۃ، ان کے خلفاء اور تربیت یافتہ لوگوں میں ایک اہم اور نمایاں نام مولانا ناظر علی کاکوروی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، جنہیں اپنے شیخ سے عاشقانہ ووالہانہ تعلق تھا، اور اپنے صاحبزادے حضرت مولانا محمد عبدالشکور

صاحب فاروقی لکھنوٗ کو ان کی خدمت میں پیش کیا اور جب وہ کچھ بڑے ہوئے تو حضرت سے ہی بسم اللہ کرائی۔

ملی خطرات کا احساس اور حق کے لئے کوشش اور فکر اور عقیدہ کی حساسیت ان کے لوگوں میں مولانا ناظر علی صاحب کاکوروی اور ان کے افراد خاندان میں خاص طور پر آئی، اور ان حضرات نے احقاق حق وابطال باطل اور اصلاح عقیدہ کے کام میں حصہ لیا، ان میں ان کے عالی مرتبت صاحبزادے امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو اپنا مشن اور سب سے اہم دینی فریضہ سمجھ کر اپنی علمی صلاحیتوں کو اس میں لگایا، جس میں ان کے بڑے معاون خود ان کے بھائی مولانا عبدالرحیم صاحبؒ اور صاحبزادگان و برادرزادگان اور دوسرے مسترشدین وتلامذہ رہے۔

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی حمایت دینی وحمیت دینی کے تعلق سے علمی لحاظ سے بھی بہت ممتاز شخصیت تھے انہوں نے اس حمایت دین کے راستہ میں بہت توجہ اور محنت کا ثبوت دیا، اور لوگوں کے ذہنوں کی بڑی اصلاح کا باعث بنے، ورنہ ایک طرف اودھ کی شیعہ حکومت اور اس کے اثرات اور دوسری طرف نصیر آباد ورائے بریلی سے آئے علماء کے اثر سے یہاں شیعیت کا پورا اثر ورسوخ ہو جاتا، اور یہاں کے اہل سنت کے افراد جو بڑی تعداد میں موجود تھے ان کو شیعیت کی ترویج کا شکار ہونا پڑتا، حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے والد مولانا ناظر علی کاکوروی اور پھر اپنے اساتذہ ومرشدین خاص طور پر حضرت شاہ عین القضاۃ لکھنویؒ (م ۱۳۴۳ھ) اور حضرت شاہ ابواحمد بھوپالی مجددیؒ (م ۱۳۴۲ھ) سے جو

فیض حاصل ہوا تھا، اس سے ان کو حمایت دین وحمیت دین وتقویت دین کے کام میں بڑی مدداور رہنمائی ملی۔

شیعہ فرقہ کی آبادی بھی لکھنؤ اور اودھ کے دوسرے حصوں میں خاصی تھی اور مزید حکومت کی وجہ سے ان کی اثر داری تھی اور اہل سنت کو اس کی وجہ سے عقیدۂ وعمل اور اپنے دوسرے معاملات میں پریشانی کا سامنا تھا، حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ نے ان خطرات کو دیکھ کر اس کی روک تھام کے لئے اپنے علم وہمت کو اس کام میں لگادیا، اور اسی علاقہ میں پاٹا نالہ کے محلّہ میں اپنا مرکز بنایا، جہاں سے انہوں نے سنت کی تلقین اور سنی مسلک کی تقویت کا کام انجام دینا شروع کیا ان کے کام کی ایک بڑی خاصیت یہ تھی کہ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت اور سرکردگی کو نمایاں کرنے کے ساتھ سادات کرام واہل بیت عظامؑ کا احترام بھی قابل لحاظ تھا اس کو پوری طرح برقرار رکھا، جیسا کہ ان کے مضامین اور ان کی کتابوں سے نمایاں اور ظاہر ہے۔

شیعوں کی طرف سے اہل سنت کے لئے جو پریشانی اور تکلیف دہ بات تھی کہ وہ صرف مسلکی اختلاف تک نہ تھی بلکہ وہ حضرات صحابہ وشیخین رضی اللہ عنہم کی مذمت اور تحقیر کا رویہ اختیار کرتے تھے جس کو اہل سنت کے واقف حضرات دیکھ کر اورسن کرنا قابل قبول سمجھتے تھے، اسی کے اثر سے یہاں لکھنؤ میں اہل سنت وشیعہ کی کشمکش بڑھی ہوئی تھی اس سلسلے میں مشہور عالم ومصنف حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ جنہوں نے حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کی صحبت اٹھائی، کہتے ہیں کہ مولانا نے ایک صحبت میں مجھ سے خود فرمایا تھا کہ ''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ناموس کی حفاظت اور ان کے خلاف کئے جانے والے پروپیگنڈے کی تردید

بجائے خود بھی عبادت بلکہ فریضہ ہے، لیکن میں جو اس کو درجہ اول کی حیثیت دیتا ہوں اور اس میں اس طرح مشغول ہوں، خدا گواہ ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مجروح ہو جانے کے بعد قرآن مجید اور نبوت محمدی سب مشکوک ہو جاتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ صحابہ کرام ہی کے واسطے سے جانتے ہیں، اگر اس سلسلے میں پہلی کڑی اور دین کے ناقلوں کی پہلی صف ہی ناقابل اعتبار ہوگئی تو قرآن اور سارا دین مشکوک ہو جائے گا اور ہمارے پاس ان کے بارے میں یقین کی کوئی علمی بنیاد نہیں رہے گی، بہر حال میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہ حمایت اور مدافعت اور ان کے دشمنوں کا یہ مقابلہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی نیت ہی سے کرتا ہوں اور مجھے اپنی مغفرت کی سب سے زیادہ امید اپنے اسی عمل سے ہے"۔

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی نے ان کے اس عمل میں غیر معمولی انہماک اور اس موضوع پر تصنیفات وتحقیقات اور علمی مناظروں میں حصہ لینے کے باوجود ان کے غیر معمولی اعتدال اور اہل بیت کے حق کو مکمل ملحوظ رکھنے کی صفت کا ذکر بھی کیا ہے جسے ان کی کتاب ''تحدیث نعمت'' میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ ایک موقع پر حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درجات کا فرق بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: حضرت علی مرتضیٰؓ سابقین اولین میں بھی پہلی صف کے اکابر میں سے ہیں اور حضرت معاویہؓ اگر چہ صحابی ہونے کی حیثیت سے ہمارے سرتاج ہیں، لیکن حضرت علیؓ سے ان کو کیا نسبت؟ ان کی مجلس میں اگر صف نعال میں بھی حضرت معاویہؓ کو جگہ مل جائے تو ان کے لئے سعادت اور باعث فخر ہے (تحدیث نعمت صفحہ ۳۴۶)

حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کی محنت کو ایک تجدیدی سطح کا کام سمجھا گیا، اور اہل حق نے اس کو بہت سراہا اس میں مقامی اہل سنت علماء اور لکھنؤ کے باہر کے جاننے والے لوگوں نے حضرت مولانا کی اس خصوصیت کو ایک طرح کی تجدیدی کوشش وکارنامہ سے تعبیر کیا، حضرت مولانا کی دینی وعلمی کارگزاری ان کی تقریروں اور وعظ ونصیحت اور تصنیفات میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں، ان کے مخالفین میں بعض نے سرسری نظر سے حضرتؒ مولانا کے اس عمل کو مسلکی تعصب ظاہر کرنے کی کوشش کی لیکن مولانا کی خود اپنی کتابوں میں جو چیزیں ہیں ان میں حضرات صحابہ کرامؓ اور اہل بیتؓ وسادات عظام کے بلند مقام کو واضح طور پر ظاہر کیا ہے اور اس میں بے راہ روی کو راہ حق سے انحراف قرار دیا ہے۔

حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ جب اپنے وصال سے ٹھیک ایک سال پہلے رجب ۱۳۶۲ھ (۱۹۴۳ء) میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے اور کانپور اور ہمارے وطن رائے بریلی بھی گئے تھے اور لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قیام فرمایا جہاں سے وہ شہر کے مختلف مقامات پر تشکیل وغیرہ کے لئے جاتے اور علماء کی خدمت میں اپنی ملاقات کے لئے جاتے، چنانچہ وہ حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ سے وقت لے کر ان کی خدمت میں بھی گئے اور ان کے متعلق اپنا ایک تاثر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بعض حضرات کے سامنے ظاہر کیا اس تاثر کو مولانا محمد منظور نعمانی اس طرح بیان کرتے ہیں: ''اس دور کے ایک مُسلَّم عارف بلکہ یقین ومعرفت کے امام حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ارشاد پر تاثرات کے اس سلسلے کو ختم کرتا ہوں، کہ ایک روز وہ دارالعلوم کی مسجد کے وضوخانہ میں وضو فرما رہے تھے اور تقریباً ایک ہفتہ دارالعلوم ندوۃ

العلماء میں قیام فرمایا تھا دارالعلوم کے دو تین اساتذہ بھی ساتھ بیٹھے وضو کر رہے تھے، مولانا معین اللہ صاحب ندوی (سابق نائب ناظم ندوۃ العلماء) مولانا کے بالکل سامنے بیٹھے وضو کر رہے تھے، حضرت مولانا کی ان پر شفقت وعنایت کی خاص نظر تھی، ان سے مخاطب ہوکر فرمایا میاں مولوی معین اللہ! حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کو جانتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: ہاں حضرت جانتا ہوں، زیارت بھی کی ہے، فرمایا! نہیں تم نہیں جانتے، پھر فرمایا وہ امام وقت ہیں، لکھنؤ کے اسی سفر میں ناچیز راقم السطور بھی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے ہم رکاب تھا، ایک صحبت میں (اب یاد نہیں کس سلسلہ میں) مولوی نور محمد صاحب سے فرمایا کہ ان مشرقی دیار میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کا وہی مقام ہے جو ہمارے مغربی دیار میں حضرت تھانویؒ کا تھا، (تھا اس لئے فرمایا کہ حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ کا وصال چند ہی روز پہلے ہو چکا تھا) (تحدیث نعمت ۳۵۱، ۳۵۲)

جہاں تک دوسرے مشائخ عصر وعلماء وقت کے اعتراف وشہادت کا تعلق ہے تو حضرت عبدالقادر صاحب رائے پوری قدس سرہ کا یہ اعتراف وشہادت ہی کافی ہے جسے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے لکھا ہے کہ: ''حضرت کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے عشق تھا، اور رفض سے بڑی نفرت وعدم مناسبت تھی، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ سے اس سلسلہ میں بڑا کام لیا، حضرت نے ان کے بہت سے رسائل اہتمام سے پڑھوا کر سنے تھے لکھنؤ کے قیام میں ایک بار مولانا حضرتؒ سے ملنے کے لئے ندوہ بھی تشریف لائے، جہاں حضرت کا قیام تھا، لاہور میں بھی ۱۹۶۰ء میں حضرت کا قیام صوفی صاحب کی کوٹھی پر تھا تشریف لائے تھے، اور جب مولانا عبدالشکور صاحبؒ کی وفات

ہوئی تو اس کے دو تین دن بعد راؤ فضل الرحمٰن خان صاحب نے اخبار پڑھتے ہوئے یہ خبر سنائی کی حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کا انتقال ہو گیا، اس خبر کے سنتے ہی فرمایا اوہو! ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' حضرت پر اس قدر اثر ہوا کہ اٹھ کر بیٹھ گئے حالانکہ بغیر دو آدمیوں کے سہارا دیئے ہوئے اٹھنا مشکل ہوتا تھا مگر اس خبر سے اتنا اثر ہوا کہ بغیر کسی مدد کے اٹھ کر بیٹھ گئے، گاؤ تکیہ کے سہارے تھوڑی دیر سکوت فرمانے کے بعد فرمایا، جب ان کے استقبال کے لئے، ابوبکر، عمر، عثمان، علی (رضی اللہ عنہم) نہ آویں گے تو کیا دوسرے کے لئے (استقبال میں) آویں گے؟ (سوانح رائے پوری ۳۱۷)

جہاں تک ان کی مدح صحابہ کی تحریک کا تعلق ہے، شیعوں کی طرف سے محرم کا پہلا عشرہ غم واندوہ جلسہ، جلوس کی شکل میں منایا جاتا تھا اور پورے عشرہ شہر اس سے متاثر ہوتا تھا اور ان کے عقیدہ مخالفت صحابہ کے طرز عمل سے ناگوار اسلوب میں مذمت کی فضا بنائی جاتی تھی اور جس کا وہ تعزیہ کی شکل میں مظاہرہ کرتے ہوئے کربلا نامی زمین میں دفن کرتے، پھر چالیس روز کے بعد چہلم کا غم مناتے اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مذمت اہل حق کے نزدیک کسی طرح برداشت نہیں کی جاسکتی تھی جس کو وہ ''تبرا'' کے لفظ سے اچھا عنوان دینے کی کوشش کرتے، جو اہل سنت کے لئے دلسوز بات ہوتی، اس سے اہل سنت کا متاثر ہونا فطری بات تھی، لیکن اس کی مخالفت کی سرکردگی کے لئے جید علماء اہل سنت کی ضرورت تھی جس کو امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقیؒ نے پورا کیا اس میں حضرت مولانا کی طرف سے کوئی جانبداری یا زیادتی نہیں ہوئی۔

ہندوستان کے دیگر علماء اہل سنت نے حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب کی تائید کی

اور تعلق رکھا، اوران کے مشن کو سراہا، ان میں خاص طور پر علماء دیو بند و ندوہ وسہارنپور، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلوی، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی، حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی، حضرت مولانا سید سلیمان ندوی، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب قاسمی سابق مہتمم دارالعلوم دیو بند، حضرت مولانا سید عبدالحی حسنی (سابق ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ ووالد ماجد حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی) حضرت مولانا سید عبدالعلی حسنی سابق ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، کہ ان حضرات کے ان کے متعلق تاریخی وتائیدی کلمات ہیں، اوران کے علاوہ ہندوستان کے جید وممتاز علماء حق نے ان کے قائم کردہ ''شہدائے اسلام'' کے جلسوں میں شرکت کر کے اور اپنے خطابات کے ذریعہ ان کے کام کو سراہا، اوران کی شخصیت کو تسلیم کیا ہے۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے ان کی وفات پر تفصیلی مضمون سپرد قلم کیا تھا اور اس میں ان کی شخصیت کو سراہا اور اس کے پس منظر کو پیش کرنے کے ساتھ ان کی دینی حمیت اور ان کے علمی مرتبہ اور تحریک ومشن کی ضرورت واہمیت وافادیت اوران کے مواعظ کی تاثیر اور خود اپنی ذات پر اس کے اثرات کو ذکر کیا ہے اوران کے قائم کردہ ''شہدائے اسلام'' کے جلسوں میں شرکت کر کے ان کے مشن وتحریک کی تائید مؤثر وطاقتور اسلوب میں کی اوران کی یہ تقاریر جو ''احاطہ شوکت علی لکھنؤ'' میں ہوئیں اوران جلسوں میں جن کے قائم ہوئے سو سال سے زائد کا عرصہ گذر چکا ہے جو چند تقاریر قلمبند کی ہوئی ملیں، جو ندوۃ العلماء لکھنؤ کے اردو ترجمان پندرہ روزہ تعمیر حیات میں شائع بھی ہوئی تھیں، انہیں اوران کے متعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی

حسنی ندویؒ کے مضمون کو اور مزید ان کی دوسری تحریروں میں سے بعض اقتباسات لے کر انہی کے خانوادے کے نورچشم عزیزی ابوالحسن علی فاروقی نے جمع کر کے ترتیب دے کر ایک مفید کام انجام دیا ہے، اور ''کتاب کے مطالعہ سے پہلے'' کے طور پر اس کا اچھا پس منظر اور حضرت مولانا کی شخصیت کا اچھا تعارف اور دل آویز تذکرہ بھی پیش کر دیا ہے۔

اب یہ ''امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنویؒ اور ان کی تحریک مدح صحابہؓ اور اس کے اثرات'' کے عنوان سے ایک مستقل کتاب بن گئی ہے جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی تحریروں وتقریروں پر مشتمل ہے اور مرتب انہی سے نام میں نسبت اور خاندانی قرابت بھی رکھتے ہیں، جو میری بھتیجی مرحومہ سیدہ امامہ حسنی بنت برادر معظم مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کے نواسے اور مولانا عبدالعلیم صاحب فاروقی نبیرۂ حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ (حال مہتمم دارالمبلغین لکھنؤ ورکن مجلس شوری دارالعلوم دیوبند ورکن مجلس انتظامی ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے پوتے ہیں سلمہ اللہ ورعاہ وبارک فیہ وتقبلہ۔

ہم ان کی اس کوشش کو قدر کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کی علمی ودینی ترقی کے لئے دعا گو ہیں کہ انہیں اپنے دادیہالی ونانیہالی بزرگوں کی نسبت ووراثت حاصل ہو، اور توفیق مزید ملے۔ وما ذلك على الله بعزيز۔

محمد رابع حسنی ندوی

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جمعہ ۲۳ رجمادی الاولی ۱۴۴۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ

از: حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی صاحب دامت برکاتہم
(مہتمم دارالمبلغین لکھنؤ)

الحمد لله و كفى و سلام على عباده الذين اصطفى. اما بعد

اللہ تعالیٰ کے بیشمار احسانات کا شکر ادا کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے، اس ناکارہ پر منجملہ تمام انعامات کے ایک بہت بڑا کرم یہ بھی ہے کہ زمانہ طالب علمی سے ہی اللہ پاک نے اپنے مخلص اور برگزیدہ بندوں سے بار بار ملاقات کرنے اور ان کی خدمات میں حاضری دینے کی توفیق نصیب فرمائی، جن اہل اللہ کی خدمت میں مسلسل رہنے کا موقع ملا ان کی ایک طویل فہرست ہے جو اس وقت ذکر نہیں کی جا سکتی البتہ جن بڑوں سے بہت زیادہ قربت رہی اور جن کو بہت قریب سے دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی ان میں ایک اہم شخصیت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمہ کی ذات گرامی ہے۔

گذشتہ صدی میں اگر عالم اسلام کی ممتاز شخصیات کو دیکھا جائے تو ان میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا نام نمایاں نظر آتا ہے بلکہ بعض خصوصیات کے اعتبار سے وہ اپنے معاصرین میں منفرد اور بے مثال تھے، مولانا اپنے علم و فضل اور بے شمار اردو اور عربی

کتابوں اور مضامین کی تصنیف وتالیف کے باوصف زہد وتقویٰ میں بھی اپنی مثال آپ تھے، مزاج میں حد درجہ سادگی ہر ایک سے گفتگو کرنے میں اس کے منصب اور خاندان کی رعایت ان کی مزاجی کیفیت تھی، حضرت مولانا ایک مرشد کامل اور شیخ وقت ہونے کے باوجود ہمیشہ اللہ والوں کی تلاش میں رہتے اور ان تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ اپنے زمانے کے تمام اکابر سے ان کا بھرپور تعلق رہا، یہ تمام بزرگ بھی اُن کو جوہرِ قابل سمجھ کر بھرپور توجہ دیتے۔ مولاناؒ کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے زمانے کے تمام مشائخ وعلماء کے چہیتے اور منظورِ نظر تھے، امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ سے بھی مولانا کو غیر معمولی تعلق اور بے پناہ لگاؤ تھا اور ان کے علم وروحانیت سے متاثر اور ان کے قدرشناس تھے، اپنی مجلسوں میں امام اہلسنت کا اور ان کے تجدیدی کارناموں کا تذکرہ بڑی عقیدت ومحبت کے ساتھ مزے لے لے کر کیا کرتے اور ان کی کوششوں کا اعتراف کرتے تھے جو اُن کی تحریروں سے ظاہر ہے، لکھنؤ میں رہتے ہوئے حضرت امام اہل سنتؒ کی خدمت میں حاضری مولانا کا معمول تھا۔

حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کو تحریک مدح صحابہؓ سے بھی گہرا تعلق تھا۔ ۱۹۳۶ء میں مدح صحابہؓ کی تحریک کے لئے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے لکھنؤ میں ایک طویل عرصہ قیام فرمایا اس دوران بھی اور اس کے علاوہ ہمیشہ حضرت مدنیؒ کا قیام مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کے مکان پر رہتا تھا اور وہ اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا علی میاںؒ ان کے خصوصی میزبان ہوتے تھے، راقم الحروف سے جلوس مدح صحابہؓ کے سلسلہ میں متعدد مرتبہ تفصیلی گفتگو فرمائی اور دعاؤں سے نواز، ۱۹۹۷ء میں جب لکھنؤ میں

جلوس مدح صحابہؓ کے سلسلہ میں کل ہند تحفظ ناموس صحابہؓ کانفرنس ہوئی تو حضرت مولانا نے اس کی سرپرستی فرمائی اور دینی ضرورت محسوس کرتے ہوئے شرکت فرمائی، اس کانفرنس میں بلامبالغہ ہزاروں علماء موجود تھے، مولانا نے اپنے پرمغز افتتاحی خطاب کے بعد حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا لکھنؤ کی سرزمین پر شاندار استقبال فرمایا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے جب شیعہ سنی مصالحتی کمیٹی بنی اور لکھنؤ کمشنری میں اس کی طویل طویل میٹنگیں ہوئیں تو حضرت مولانا خصوصی طور پر احوال دریافت فرماتے رہتے تھے پھر جب ۱۹۹۸ء میں پہلی مرتبہ جلوس مدح صحابہؓ نکالا گیا تو اسی دن عصر کے بعد حضرت مولانا کا فون آیا، بڑی مسرت اور خوشی کے ساتھ مبارکباد اور دعائیں دیں۔

حضرت مولانا کو ہمارے پورے خاندان سے بہت محبت تھی اور ملاقات کے وقت بڑی شفقت فرماتے تھے، ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ: ''مدح صحابہؓ کے سلسہ میں تو آپ کام کررہے ہیں ختم نبوت کی بھی فکر کیجئے، اس لئے کہ لکھنؤ اور اطراف میں قادیانی سرگرمیاں شروع ہوگئیں ہیں۔'' مولانا کی اس بات پر تعجب محسوس ہوا کہ یہاں لکھنؤ میں تو قادیانی بظاہر کوئی کام نہیں کررہے ہیں، مگر بعد میں جب میں نے اس کام کے لئے محنت شروع کی تو پتہ چلا کہ رائے بریلی روڈ پر ان کا مرکز قائم ہوچکا ہے اور ان کی دسیسہ کاریاں پھیل رہی ہیں، اس وقت احساس ہوا کہ مولاناؒ نے بروقت متوجہ فرمایا۔

قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید

جب حضرت مولاناؒ کے خاندان سے رشتہ داریاں قائم ہوئیں تو راقم الحروف پر ان

کی شفقتیں اور عنایتیں مزید تر ہوگئیں اور گویا ایک سرپرستی کا تعلق قائم ہوگیا جو آج بھی حضرتؒ کے وصال کے بعد مخدوم ومحترم مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب دامت برکاتہم کے ذریعہ قائم ہے، والد محترم حضرت مولانا عبدالسلام فاروقی علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد راقم الحروف جب بھی حضرت سے ''شہدائے اسلام'' کے جلسوں میں شرکت اور تقریر کی درخواست کرتا تو از راہ شفقت قبول فرماتے، مولانا ان جلسوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ایک مرتبہ دوران تقریر ارشاد فرمایا ''امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ نے ان جلسوں کو تبلیغ دین اور اشاعت حق کے لئے قائم فرمایا، میر نظر عالم اسلام پر ہے، پوری دنیا میں ان جلسوں کی مثال نہیں ملتی ہے''۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''شہدائے اسلام'' کے جلسوں میں جو تقریریں فرمائیں ان میں سے بعض جو محفوظ تھیں اور حضرت امام اہل سنتؒ کے بارے میں جو مشاہدات اور جو باتیں مختلف موقعوں پر تحریر فرمائیں، ان کو میرے پسر زادے عزیزم ابوالحسن علی سلمہ نے یکجا کیا ہے، جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو قبول فرمائے، مزید حسنِ تحریر وتقریر کی دولت سے نوازے اور ان کے قلم کو جاری اور رواں فرمائے۔ آمین

عبدالعلیم فاروقی
مہتمم دارالمبلغین لکھنؤ

۲۹ رجمادی الاخریٰ ۱۴۴۲ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرض مرتب

الحمد لله و كفى و سلام على عباده الذين اصطفى. اما بعد

گزشتہ دنوں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ترجمان رسالہ ۱۵؍روزہ ”تعمیر حیات“ کی کچھ پرانی فائلیں دیکھ رہا تھا تو اس میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی بعض اہم تقریریں نظر آئیں، جو حضرت مولاناؒ نے ”شہدائے اسلام“ کے ۱۵؍روزہ تبلیغی واصلاحی جلسوں میں کی تھیں، اس موقع پر خال معظم مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی مدظلہ نے توجہ دلائی کہ ان خطبات کو مرتب کردیا جائے تو عام مسلمانوں کے لئے انتہائی اہم اور مفید کام ہوگا، اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عظمت اور حضرات اہل بیت رضی اللہ عنہم کی محبت وعقیدت کے سلسلہ میں حضرت مولانا علیہ الرحمہ کا موقف اور مسلک سامنے آجائے گا۔

چنانچہ مولانا سید محمود حسن حسنی صاحب کی تحریک پر جب اس کام کو شروع کیا تو امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقی علیہ الرحمہ کے سلسلہ میں بھی حضرت مولاناؒ کے بعض تاثرات نظر آئے، اور داعیہ پیدا ہوا کہ ان اہم اور مفید تحریروں کو بھی ان خطبات کے ساتھ شامل کرکے کتابی شکل دے دی جائے، اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ کچھ ہی عرصہ میں یہ کام پایۂ تکمیل

کو پہونچ گیا، اس کتاب میں حضرت مولاناؒ کی تین اہم تقریریں اور امام اہل سنتؒ کے متعلق ان کی بعض تحریروں کے اقتباسات پیش کئے گئے ہیں، جن سے ان دونوں بزرگوں کے تعلقات اور باہم محبت والفت کا علم ہوتا ہے، اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور ان کے افراد خاندان واساتذہ ومشائخ کے یہاں امام اہل سنتؒ کا کیا مقام ومرتبہ تھا؟ معلوم ہوتا ہے۔

حضرت مفکر اسلامؒ کو جتنا تعلق امام اہل سنتؒ سے تھا اتنا ہی ان کے مشن وتحریک سے تھا، چنانچہ عمر کے آخری حصہ تک نہ صرف اس سے وابستہ رہے بلکہ اس کے بڑے داعی و مؤید بھی رہے، اور ''شہدائے اسلام'' کے جلسوں میں حتی الامکان شریک ہوتے تھے ر۱۹۹۷ء میں مجلس تحفظ ناموس صحابہؓ کے زیر اہتمام ''ادارۂ دار المبلغین '' کے ''مولانا عبدالشکورؒ ہال'' میں جلوس مدح صحابہؓ کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان عوامی اجلاس منعقد ہوا تھا، جس میں حضرت مولاناؒ نہ صرف شریک ہوئے بلکہ اس کی سرپرستی فرمائی اور باہر سے آنے والے مہمانوں میں حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کا زبردست استقبال کیا، اور اسی اجلاس میں جلوس مدح صحابہؓ کے متعلق واضح تائیدی کلمات ارشاد فرمائے۔

حضرات صحابہ کرامؓ، ان کے درمیان فرق مراتب اور ان کے مشاجرات کے سلسلہ میں حضرت مولاناؒ بہت حساس تھے، اور افراط وتفریط بالکل برداشت نہیں فرماتے تھے، اس کا اندازہ حضرت مولاناؒ کے ان خطبات سے بخوبی ہو جائے گا جو اس کتاب میں جمع کئے گئے ہیں، ان کے علاوہ بھی حضرتؒ کی بہت سی تحریریں اس تعلق سے موجود ہیں، جس میں انہوں نے اہل سنت و جماعت کے عقیدہ اور موقف کو پوری قوت کے ساتھ بیان کیا ہے، چنانچہ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

ندوۃ العلماء کے بانی و ذمہ داران اور کارکن اہل سنت والجماعت کے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے متفقہ اور تحقیقی مسلک کے مطابق "الصحابۃ کلھم عدول" (صحابۂ کرام سب صادق وامین اور معتبر ہیں۔) کے قائل ہیں۔اور ان کا ایمان ہے کہ تربیت نبوی اور شرف صحابیت کی وجہ سے وہ سب حیات جاہلیت (عہد قبل اسلام) کے اثرات سے ممکن اور زیادہ سے زیادہ قابل تصور حد تک پاک اور محفوظ ہو گئے تھے۔ محققین وراسخین اہل سنت کا عقیدہ ہے کہ امت کا بڑے سے بڑا صاحب صلاح وفضائل فرد، صاحب کرامات وخوارق بزرگ کسی غیر مشہور سے غیر مشہور صحابی کے درجہ کو نہیں پہنچتا ہے۔ کہ صحبت نبوی مقبولیت عنداللہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔(۱)

راقم السطور نے چند صفحات ''کتاب کے مطالعہ سے پہلے'' کے عنوان سے بھی تحریر کیے ہیں، جس میں امام اہل سنتؒ اور ان کی خدمات کے مختصر تذکرہ کے ساتھ ساتھ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور ندوۃ العلماء کے دیگر ذمہ داران کے امام اہل سنتؒ سے غیر معمولی تعلق اور ان کے مشن وتحریک میں تعاون اور ان کی دینی خدمات کے اعتراف کے سلسلہ میں بھی کچھ باتیں آئی ہیں،اس کے بعد کتاب کو مضامین کے اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے، پہلے حصہ میں امام اہل سنت حضرت مولانا محمد عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق حضرت مولاناؒ کی تحریریں جمع کی ہیں اور دوسرے حصہ میں ''شہدائے اسلام'' کے تبلیغی واصلاحی جلسوں میں کی گئیں حضرت مولاناؒ کی وہ تقریریں ہیں

(۱) تعمیر حیات،لکھنؤ،۲۵/اپریل ۱۹۹۲ء۔

جو ان کے موقف کی بھرپور ترجمان اور ''شہدائے اسلام'' کے جلسوں کا پیغام ہیں، سادہ الفاظ اور عام فہم اسلوب کی وجہ سے عام مسلمانوں کے لیے انتہائی مفید اور عقیدہ کو پختہ کرنے والی ہیں، کتاب کا اختتام حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کے اس منظوم کلام پر ہے جو آپ نے امام اہل سنتؒ کے متعلق تحریر فرمایا تھا۔

ہم ان تمام حضرات کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے کتاب کی تیاری میں کسی بھی طرح سے تعاون کیا، اللہ تعالی جزائے خیر عطا فرمائے مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دامت برکاتہم کو (جو راقم السطور کے پرنانا حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کے برادر حقیقی ہیں) کہ جب آپ کے سامنے کتاب کا مسودہ پیش کیا تو بہت حوصلہ افزائی فرمائی اور مفصل اور وقیع ''مقدمہ'' تحریر فرما کر کتاب کی افادیت میں اضافہ کیا، کتاب کی ترتیب وحواشی کے سلسلہ میں جد امجد حضرت مولانا عبدالعلیم فاروقی صاحب دامت برکاتہم کی سرپرستی حاصل رہی اور آپ نے بھی اپنی قیمتی تحریر سے نوازا جس کو بطور'' تقریظ'' کتاب میں شامل کیا گیا ہے، اللہ تعالی ہمارے تمام اکابر کو صحت وسلامتی کے ساتھ لمبی عمر عطا فرمائے اور امت کو ان کے فیوض وبرکات سے مستفید ہونے کی سعادت عطا فرمائے۔ آمین

أحب الصالحين ولست منهم
لعل الله يرزقني صلاحا

ابوالحسن علی فاروقی

۲۰۲۱/۲/۱۵

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب کے مطالعہ سے پہلے

از مرتب

الحمد لله و کفیٰ وسلام علی عباده الذین اصطفی أما بعد!

شیعوں کی ہندوستان آمد اور فیروز شاہ تغلق کا سخت ردعمل:

چودھویں صدی عیسوی میں خاندانِ تغلق کے زمانہ میں ہی ایسے اسلام دشمن عناصر اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کے لئے ہندوستان کا رخ کرنے لگے تھے جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے لیکن ان کا ہر عمل اسلام مخالف تھا، وہ نماز پڑھتے لیکن ان کی نمازیں مسلمانوں سے مختلف ہوتیں، روزہ رکھتے تو اس میں بھی وہ طرز اختیار کرتے جس سے اسلام اور مسلمان بری ہیں، وہ نبی کو تو مانتے لیکن بارہ اماموں کو نبی سے بڑھ کر مانتے، وہ قرآن پڑھتے لیکن ان کا عقیدہ یہ ہوتا کہ موجودہ قرآن تحریف شدہ ہے، اصل قرآن کوئی صاحب کسی نامعلوم غار میں لے کر چلے گئے ہیں، وہ محب اہل بیت ہونے کا دعوی کرتے لیکن حقیقت میں حضرات اہل بیتؓ کے فیصلے انہیں منظور نہیں تھے، لیکن اس موقع پر ان لوگوں کو کوئی خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی، فیروز شاہ تغلق [1] نے ان کے باطل عقائد کے

---

(1) فیروز شاہ تغلق (۱۳۰۹ء-۱۳۸۸ء) تغلق خاندان کا تیسرا حکمران تھا، جس نے ۱۳۵۱ء سے ۱۳۸۸ء تک حکومت کی۔

خلاف سخت ردعمل اختیار کیا، چنانچہ وہ اپنی خودنوشت ''فتوحاتِ فیروز شاہی'' میں لکھتے ہیں:

''شیعوں کے فرقہ نے جسے روافض بھی کہا جاتا ہے، اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کی، انہوں نے کتابیں اور رسالے لکھے، اور ہمارے مذہب کے پہلے سرداروں (خلفائے راشدینؓ) کی بے حرمتی کی، میں نے ان سب کو گرفتار کیا اور سزا دی، ان کی کتابیں جلادیں، اور اس طرح اللہ کے فضل سے اس فرقہ کا بالکل قلع قمع ہوگیا''۔ (۱)

ان سطور سے یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے کہ ابتدائی دور میں ہندوستان میں شیعیت کو کوئی خاص فروغ حاصل نہیں ہوسکا، چھوٹی چھوٹی بستیوں میں بھی مسلمانوں کے مدارس، خانقاہیں اور تربیت گاہیں آباد تھیں، اور علماء امت پورے زور وشور کے ساتھ دین کی تبلیغ اور علم کی ترویج میں منہمک تھے، عقائد کی اصلاح اور تزکیۂ نفوس کے لئے مجالس ومحافل منعقد کی جارہی تھیں۔

ارباب علم وادب کی اودھ کی جانب ہجرت

چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں تیموری شورش (جس کی لپیٹ میں مختلف سلطنتیں آئیں، اور بیشمار حکومتیں زیروزبر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں، ہر طرف فتنہ وفساد کے شعلے بھڑک اٹھے اور خون کی ندیاں رواں ہوگئیں) کے زمانہ میں دہلی کی آبادی بے اطمینانی کی زندگی گزارنے پر مجبور تھی اور ان پر ایک غیر یقینی کیفیت طاری تھی، علماء ومشائخ کی دوررس نگاہیں مستقبل کی تاریکی کو بھانپ چکی تھیں، چنانچہ انہوں نے ملک کے دوسرے علاقوں

(۱) امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی حیات وخدمات، ص: ۲۱۸۔

خاص طور پر جونپور واطراف اور اودھ کے مختلف قصبات کی جانب ہجرت شروع کی، جہاں علم دوستوں نے ان قافلوں کا استقبال پورے جوش وخروش سے کیا، اہل علم اور ارباب دین کی آمد اور ان کی برکات نے ان قصبات کو منور کردیا، ہر جانب سے قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں بلند ہونے لگیں، اور یہاں کا چپہ چپہ علم ودانش کا گہوارہ بن گیا۔

حکومت ہند میں شیعوں کا عمل دخل

سولہویں صدی عیسوی میں ایرانی بادشاہ کی مدد سے کابل وقندھار فتح کر کے ہمایوں [1] جب ہندوستان پہنچا تو اس کے ساتھ ایرانی سپاہیوں کا ایک بڑا لشکر تھا، علماء وامراء اور ارباب سیاست بھی اس کے ساتھ تھے، اسی وقت سے ہندوستان وایران کے تعلقات دوستانہ ہوگئے، اور ہندوستان میں شیعہ عمال کا عمل دخل بڑھنے لگا، طب، سیاست، فوج اور ارباب ادب میں شیعوں کی تعداد روز بروز بڑھتی رہی، تمام شعبوں میں ان کے افراد کلیدی عہدوں پر فائز ہونے لگے، اس طرح ان کو اپنے مذہبی معاملات میں کافی آزادی مل گئی، اور یہ لوگ زور شور سے اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت میں مشغول ہوگئے۔

سرزمین اودھ میں شیعوں کی بادشاہت کا اعلان

چنانچہ اٹھارویں صدی عیسوی میں اورنگ زیب [2] رحمۃ اللہ علیہ (۱۶۱۸-۱۷۰۷) کے

(۱) نصیر الدین محمد ہمایوں (۱۵۰۸ء-۱۵۵۶ء) مغلیہ سلطنت کے دوسرے حکمراں، انہوں نے ۱۵۲۶ء سے ۱۵۴۰ء تک اور پھر ۱۵۵۵ء سے ۱۵۵۶ء تک حکومت کی، یہ مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر کے بیٹے اور جلال الدین اکبر کے والد ہیں۔

(۲) اورنگ زیبؒ (۱۶۱۸ء-۱۷۰۷ء) نہایت متقی، پرہیزگار، مدبر اور اعلی درجہ کے منتظم تھے، آپ نے اپنے زمانہ میں بدعات ورسوم کے قلع قمع اور معاشرہ کی اصلاح میں جو کردار ادا کیا وہ قابل تعریف ہے، ۱۶۵۸ء سے ۱۷۰۷ء تک آپ سلطنت مغلیہ کے بادشاہ رہے۔

دور میں ہی شیعوں کی نظریں مغلیہ سلطنت کی جانب اٹھنے لگیں، بادشاہ کے پختہ مسلمان ہونے کے باوجود ان کے درباریوں اور ان کے امراء میں اکثریت شیعوں کی ہوگئی، اور ان کے جانشینوں کے دور میں شیعیت کھل کر سامنے آئی، اور صورتِ حال یہ پیدا ہوئی کہ ٹکراؤ کی نوبت آ گئی۔

شمالی ہند میں شیعیت کا بڑا مرکز اودھ اور خاص طور پر لکھنؤ بنا، نوابین اودھ کو مغلیہ سلطنت کی جانب سے مختلف علاقوں میں صوبہ دار کی حیثیت سے متعین کیا گیا تھا، لیکن انہوں نے اپنی طاقت بڑھانی شروع کر دی، اور مرکزی حکومت کی روز بروز تنزلی وانحطاط سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان علاقوں میں اپنی پکڑ مضبوط کر لی، چنانچہ انیسویں صدی عیسوی میں ان لوگوں نے سر زمین اودھ میں بادشاہت کا اعلان کر دیا۔

شیعی افکار کی نشر واشاعت میں حکومت اودھ کا تعاون اور مسلمانوں پر مظالم کی انتہاء

نوابین اودھ مذہبا ''شیعہ اثنا عشریہ'' اور اپنے مذہبی عقائد کے متعلق بڑے حساس اور پر جوش تھے، لہٰذا شیعیت کی نشر واشاعت میں ان لوگوں نے کسی طرح کی کوئی کوتاہی برداشت نہیں کی، اور اس کی تبلیغ میں ہمہ تن مصروف ومشغول رہے، نوابین اودھ انتہائی متعصب اور غالی تھے، ان کا نظریہ اور ان کی فکر یہ تھی کہ مسلمانوں کو تمام کلیدی عہدوں سے دور رکھا جائے اور انتظامی امور میں ان کا کوئی حصہ نہ ہو، تا کہ معاشی اعتبار سے وہ پسماندہ ہو جائیں، اس مقصد کے حصول کے لئے ان لوگوں نے مختلف حیلوں اور بہانوں سے ارباب علم وادب کی جاگیریں ضبط اور وظائف موقوف کرنا شروع کر دئے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد چند سکوں اور زمین کے کچھ حصوں کی حفاظت کے لئے اپنے دین کو نیلام کر کے ارتداد کا شکار ہوگئی، ایسے بہت سے لوگوں کو اعلیٰ عہدے عطا کئے

گئے جو اسلام کو چھوڑ کر مذہب شیعہ میں داخل ہو گئے تھے، اہل علم و دانش کو ستایا گیا، مدارس اور خانقاہوں کی امداد بالکل موقوف کر دی گئیں، علم و عرفاں کے وہ گہوارے جو صدیوں سے رشد و ہدایت کا مرکز بنے ہوئے تھے، آہستہ آہستہ ویران ہونے لگے، تہذیب و ثقافت کے نام پر شیعی افکار و نظریات کو فروغ دینے کی نت نئی تدبیریں ہونے لگیں، اس سلسلہ میں حکومت نے بڑی امداد کی اور شیعیت کی اشاعت میں فراخ دلی کا مظاہرہ کیا، یہاں ایک بات یہ بھی قابل ذکر ہے کہ بہت سے صوفی منش لوگوں نے حکومت کا قرب حاصل کرنے کے لئے اور انعام و اکرام کی لالچ میں ''تفضیلیت'' کا مذہب اختیار کر لیا تا کہ اہل سنت میں بھی ان کا اعتبار باقی رہے اور خلیفۂ رابع حضرت علیؓ کو خلفائے ثلاثہؓ پر فضیلت دینے کی بنا پر شیعوں کی جانب سے امداد بھی جاری رہے، آج بھی ان کے ماننے والے اسی تفضیلی مسلک کو اختیار کئے ہوئے ہیں اور رافضیوں کی تائید کا کوئی موقع نہیں چھوڑتے ہیں۔

اودھ کے مسلمانوں پر شیعی ماحول کا اثر

اودھ کے مسلمانوں پر شیعی ماحول کے جو اثرات مرتب ہوئے، ان کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر عبدالحی فاروقی [1] صاحبؒ لکھتے ہیں:

''لکھنؤ صوبہ اودھ کا دارالسلطنت تھا، اور اودھ پر شیعوں کی حکومت تھی، اس

(۱) پروفیسر عبدالحی فاروقی (۱۹۲۳ء-۲۰۱۳ء) مولانا عبدالمومن فاروقیؒ کے صاحب زادے اور امام اہل سنتؒ کے پوتے تھے، آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے (معاشیات) کیا اور اردو زبان وادب کے امتحانات بھی اچھے نمبرات سے پاس کئے، ایک طویل عرصہ تک جامعہ ہمدرد نئی دہلی سے منسلک رہے اور جامعہ کے بانی حکیم عبدالحمید صاحبؒ کے معتمد رہے، آپ نے تصنیفی میدان میں دیگر کتابوں کے علاوہ امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کی حیات و خدمات پر ایک ایسی معلوماتی کتاب لکھی جو علمی حلقوں میں آپ کے تعارف کا ذریعہ بن گئی۔

لئے لکھنؤ کو شیعی دنیا میں ایک مرکزی حیثیت حاصل ہوگئی تھی، یہاں کے رہن سہن، طور طریق اور پورے تہذیب وتمدن پر شیعی رنگ غالب تھا، "الناس علی دین ملوکھم" کے مقولہ کے مطابق یہاں کی رعایا اپنے آقاؤں کے نقش قدم پر چلنا اپنے لئے باعث فخر خیال کرتی تھی، عوام تو عوام تھے خواص اہل سنت کا بھی یہی عالم تھا کہ وہ اپنے دین ومسلک کے مقابلہ میں حکومت وقت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، شیعی مجلسوں، محفلوں اور مذہبی رسوم میں رونق بڑھانے کا ذریعہ اور وسیلہ یہی سنی عوام تھے، جو اپنی غربت اور جہالت کی وجہ سے اپنی دینی شناخت کھو چکے تھے، اس دور میں سنیوں میں تعزیہ داری عام تھی، حتی کہ خود لکھنؤ میں تعزیہ بنانے اور ان کو فروخت کرنے کا کاروبار زیادہ تر سنی ہی کیا کرتے تھے، آئے دن یہاں تعزیے، دُلدُل، مہندی اور جلوسہائے عزا نکلا کرتے تھے، جن میں بھیڑ بھاڑ اور شان بڑھانے کا ذریعہ یہی سنی عوام ہوتے تھے"۔(۱)

امام اہل سنتؒ کی ولادت اور تعلیم وتربیت

سطور بالا سے واضح ان ناگفتہ بہ حالات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی ایسا مجدد پیدا ہو جو حالات کے دھارے کو موڑ دے اور مسلمانوں میں دینی شعور اور مذہب کے تئیں بیداری پیدا کرے، عقائد کی اصلاح کرے، اور مسلمانوں کو رسوم وبدعات کے دلدل سے نکال کر رشد وہدایت کی جانب گامزن کرے، ان کے دلوں میں دین کی معرفت، اہل

(۱) امام اہل سنت مولانا عبد الشکور فاروقیؒ حیات وخدمات، ص: ۲۳۶-۲۳۷۔

بیتؓ کی محبت اور صحابہؓ کی عظمت پیدا کرے، اسلامی فکر عام کرے اور معاشرے میں دینی مزاج پیدا کرے، اس اہم تقاضہ کو پورا کرنے کے لئے اودھ کے تاریخی اور مردم خیز قصبہ کاکوری ضلع لکھنؤ میں ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۹۳ھ مطابق ۱۸۷۶ء کو مولوی حافظ ناظر علیؒ[۱] کے گھرانے میں اس بچہ کی پیدائش ہوئی جس کی خوشخبری اس کے والد کو ان کے شیخ حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ہنسویؒ[۲] نے ان الفاظ سے دی تھی "انشاء اللہ تم کو ایک نیک فرزند عطا ہوگا جس سے تمہارے گھر میں خیر و برکت ہوگی"، آگے چل کر اسی نومولود کو امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے یاد کیا گیا، آپ کی ذات اس عظیم اور بابرکت شخصیت کی حامل تھی، جس نے اپنی علمی خدمات، فکری بلندی، اور جہد مسلسل سے ایک انقلاب برپا کردیا، آپ کی ابتدائی تعلیم فتحپور میں ہوئی، جہاں مختلف اساتذہ سے ابتدائی کتابیں پڑھیں، بقیہ علوم کے لئے لکھنؤ کا سفر کیا اور استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سید عین القضاۃؒ[۳] کی زیر تربیت مسلسل سات سال تک تعلیم حاصل کی، علوم دینیہ کے

(۱) مولوی حافظ ناظر علیؒ (۱۸۴۳ء-۱۹۱۱ء) امام اہل سنت کے والد تھے، عربی اور فارسی کے ایک اچھے عالم، اور سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگ ہونے کے ساتھ ساتھ مختلف علاقوں میں تحصیلدار رہے، آپ کی ابتدائی تعلیم کاکوری اور اعلیٰ تعلیم لکھنؤ میں ہوئی اور حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ سے بھی اچھے روابط رہے، بیعت و خلافت کا تعلق حضرت شاہ عبدالسلام ہنسوی سے تھا۔

(۲) حضرت شاہ سید عبدالسلام ہنسویؒ (۱۲۳۴ھ-۱۲۹۹ھ) سلسلۂ نقشبندیہ کے عالی مرتبت بزرگ اور جلیل القدر مشائخ میں سے تھے، آپ کی پوری زندگی فقر و توکل، ذکر و عبادت اور ارشاد و تربیت میں گزری، آپ کی حد درجہ فنائیت وللّٰہیت کی وجہ سے حضرت شاہ احمد سعید مجددی (۱۲۱۷ھ-۱۲۷۷ھ) نے آپ کو خلافت سے نوازا۔

(۳) حضرت مولانا عین القضاۃؒ (م ۱۹۲۵ء) ایک بڑے عالم اور صاحب سلسلہ بزرگ تھے، آپ کو حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی سے شرف تلمذ بھی حاصل تھا، آپ نے مدرسہ فرقانیہ کے ذریعہ سے لکھنؤ واطراف میں قرآن مجید کی قرأت کے سلسلہ میں جو کام کیا وہ کسی تجدیدی سلسلہ سے کم نہ تھا۔

حصول کے بعد لکھنؤ کے مشہور و معروف اور معتبر طبیب حکیم عبدالولی صاحبؒ[1] سے طب کی تعلیم حاصل کی۔

درس قرآن کا آغاز

تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ نے اپنے آپ کو مصروف رکھنے کے لئے کچھ دنوں مطب بھی کیا لیکن اپنے استاد مولانا عین القضاۃؒ کے مشورہ سے یہ مشغلہ ترک کر کے اپنے حقیقی رجحان کے مطابق درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں منہمک ہوگئے، اور انہی کے ایما پر ایک مسجد میں درس قرآن کا آغاز کیا، جس کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس کے ذریعہ سے بہت سے لوگوں کی اصلاح ہوئی، مولانا عین القضاۃ صاحبؒ نے جب آپ کا درس سنا تو بڑی خوشی کا اظہار فرمایا، اور اصرار کیا کہ: ''اگر لوگ آپ کو تقریر کے لئے بلائیں تو آپ چلے جایا کریں، آپ بہت اچھا ترجمہ قرآن بیان کرتے ہیں اور تقریر بھی اچھی کر لیتے ہیں''[2]۔

سلسلۂ مواعظ کا آغاز

اپنے استاد کے اصرار پر آپ نے تقریر کا سلسلہ شروع کیا تحریک مدح صحابہؓ کے ابتدائی ایام میں آپ کی تقریریں مسلسل چھ سات گھنٹے تک ہوتی تھیں اور ہزاروں کا مجمع اپنی تشنگی دور کرتا تھا، ایک خاص بات یہ تھی کہ ہزاروں کے مجمع کو آپ بغیر مائک کے خطاب فرماتے تھے،

(۱) حکیم عبدالولی بن حکیم عبدالعلی لکھنویؒ (۱۸۷۳ء-۱۹۱۲ء) ایک ماہر اور شہرت یافتہ حکیم تھے، دس برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد ابتدائی تعلیم مولوی سید محمد مقیم حسنی رائے بریلویؒ سے، حکمت کی تعلیم فرنگی محل میں اور طب کی تعلیم اپنے والد اور چچا سے حاصل کی، تعلیم کی تکمیل کے بعد آپ نے مدرسی اختیار کی، آپ کے حلقۂ درس میں شریک ہونے والی ممتاز شخصیات میں مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء، شفاء الملک حکیم عبدالحسیب وغیرہ ہیں۔

(۲) امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی، حیات و خدمات، ص:۷۹۔

اور ہر شخص آپ کی آواز کو آسانی کے ساتھ سن لیتا تھا، زندگی کا ایک بڑا حصہ خطبات ومواعظ کے سلسلہ میں گزرا، اور دور دراز علاقوں میں آپ کے خطبات کے بہترین اثرات مرتب ہوئے، آخری زمانہ میں آپ نماز پر ہی بیان فرماتے، اور اللہ تعالیٰ نے ایسا اثر دیا تھا کہ دوسرے ہی دن سے مسجدوں میں مصلیوں کا ایسا ازدحام ہو جاتا کہ جگہ تنگ پڑنے لگتی، آپ کا انداز بیان پروقار اور عالمانہ شان کا حامل تھا، الفاظ بالکل سادہ اور عام فہم ہوتے تھے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی صاحبؒ[1] دریاباد کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں:

دریاباد ایک زمانہ میں برسوں آنا ہوتا رہا تھا، وعظ سادہ و بے تکلف، عام فہم ودلنشیں اور ہمیشہ نماز ہی پر فرماتے اور نماز باجماعت کے فضائل اس خوبی اور دلکشی سے بیان کیے کہ نمازیوں کی تعداد میں مستقل اور نمایاں اضافہ ہو گیا، یہاں تک کہ جامع مسجد کی عمارت ناکافی ثابت ہوئی، اور اس میں توسیع کرنا پڑی[2]۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء سے تعلق

جب بانیان ندوۃ العلماء نے فکر ندوہ کو فروغ دینے اور ملک بھر میں اس کی نشر واشاعت کے لئے دارالعلوم کی بنیاد ڈالی، تو ان کی نظریں ایسی شخصیات کو تلاش کرنے لگیں جو فکر اسلامی میں مہارت تامہ رکھتے ہوں اور ندوہ کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہوں، چنانچہ اس کار عظیم کے لئے جن اولین شخصیتوں کا انتخاب ہوا ان میں ایک نام امام اہل سنتؒ کا بھی تھا۔

(۱) مولانا عبدالماجد دریابادیؒ (۱۸۹۲ء - ۱۹۷۷ء) اپنے وقت کے بڑے مفسر اور جید عالم تھے، آپ تصنیف وتالیف کے ساتھ ساتھ بہت سے دینی وملی اداروں سے بھی وابستہ رہے، آپ نے قرآن مجید کی جو تفسیر فرمائی وہ اپنے آسان اسلوب اور جامعیت کے اعتبار سے امتیازی حیثیت کی حامل ہے، اس کے علاوہ بھی آپ نے ایک درجن سے زائد کتابیں تحریر فرمائیں، جو مقبول ہر خاص وعام ہوئیں۔

(۲) ہفت روزہ حرم، لکھنؤ، ۲۶ رمئی ۱۹۶۲ء

آپ نے درس وتدریس کا آغاز بانی ندوۃ العلماء حضرت مولانا محمد علی مونگیری (۱) رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش پر ندوہ سے کیا، اس وقت دار العلوم خاتون منزل گولا گنج لکھنؤ میں قائم تھا، اس دور کے مدرسین میں مولانا محمد فاروق چریا کوٹیؒ (۲)، مولانا حفیظ اللہ صاحب (م ۱۹۴۳ء) اور مولانا مفتی عبد اللطیف سنبھلیؒ (م ۱۹۵۹ء) قابل ذکر ہیں، کچھ عرصہ بعد مولانا چریا کوٹی مدرس اعلیٰ ہو گئے، مولانا چریا کوٹی امام اہل سنتؒ کے بہت معترف تھے، چنانچہ ایک سال کے بعد امام اہل سنتؒ نے جب تصنیف وتالیف کی مصروفیات کی وجہ سے ندوہ سے استعفیٰ دیا تو مولانا چریا کوٹی نے اس کو ''ورق نامۂ فراق'' سے تعبیر کیا، امام اہل سنتؒ کے زمانۂ تدریس میں علامہ سید سلیمان ندویؒ (۳)، مولانا ضیاء الحسن علویؒ، اور مولانا

---

(۱) مولانا محمد علی مونگیریؒ (۱۸۴۶ء - ۱۹۲۷ء) تحریک ندوۃ العلماء کے بانی اور ناظم اول تھے، مولانا لطف اللہ علی گڑھیؒ سے مختلف علوم حاصل کئے اور مدرسہ فیض عام کانپور اور مظاہر علوم سہارنپور میں بھی تعلیم حاصل کی، اور حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی سے ارادت کا تعلق قائم کیا، اور خلافت سے سرفراز ہوئے، ندوۃ العلماء کی بنیاد کے علاوہ رد قادیانیت ومسیحیت پر بھی آپ کی خدمات نمایاں ہیں۔

(۲) مولانا محمد فاروق چریا کوٹی صاحبؒ (م ۱۹۰۹ء) کے متعلق علامہ سید سلیمان ندویؒ ماہنامہ معارف، جولائی ۱۹۳۵ء میں تحریر فرماتے ہیں کہ ''وہ (مولانا چریا کوٹی) ادب وفقہ کے امام تھے''۔ مولانا چریا کوٹی نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی وطن میں حاصل کی، فقہ اور اصول فقہ مفتی محمد یوسف بن مولوی اصغر لکھنوی سے جونپور میں پڑھا، پھر سفر حج کے موقع پر وہاں کے علماء سے بھی استفادہ کیا، آخر عمر میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے شعبۂ تدریس سے وابستہ ہو گئے، جہاں ایک مدت تک فرائض انجام دیے، آپ علامہ شبلی نعمانی کے استاد بھی تھے۔

(۳) علامہ سید سلیمان ندویؒ (۱۸۸۴ء - ۱۹۵۳ء) ایک نامور مؤرخ اور جید عالم دین تھے، آپ کی پوری زندگی علمی خدمات کے لئے وقف تھی، دار العلوم ندوۃ العلماء میں سات سال تک تعلیم حاصل کی، پھر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے آپ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا، اس کے ساتھ ساتھ آپ نے ایک درجن سے زائد کتابیں تحریر فرمائیں، جن کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، ایک عرصہ تک آپ دار العلوم ندوۃ العلماء سے بھی وابستہ اور فکر ندوہ کے ترجمان رہے۔

منظور النبی سہارنپوریؒ وغیرہم دار العلوم میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

دار العلوم ندوۃ العلماءؒ سے استعفیٰ دینے کے بعد ایک وقتی ضرورت کے تحت دہلی کا سفر ہوا، وہاں مرزا حیرت دہلوی صاحب (م ۱۹۲۸ء) کی خواہش پر ان کے مکتبہ میں تصنیف وتالیف کے کام میں مشغول ہو گئے، دہلی میں چار سال قیام رہا، اس دوران حضرت شاہ ابوالخیر صاحب مجددیؒ[1] کی خدمت میں مسلسل حاضری دیتے رہے۔

شیعوں کی فرقہ وارانہ سازش اور امام اہل سنت کی آمد

۱۹۰۴ء کے آس پاس مولوی مقبول احمد شیعی دہلوی[2] کی مجلسیں لکھنؤ میں ہونے لگیں، اور اس کی دل آزار اور تبرائی تقریروں سے لکھنؤ کا پرسکون ماحول درہم برہم ہونے لگا، اور مسلمانوں کو اس نے مناظرے کے چیلنج دئے تو حضرت مولانا عین القضاۃ صاحبؒ نے مقامی علماء کے ساتھ اس مسئلہ پہ غور وخوض کیا، آپ کی رائے یہ ہوئی کہ دہلی سے مولانا عبدالشکور صاحبؒ کو بلایا جائے وہی علماء اہل سنت کی طرف سے مدافعت کا فریضہ پوری طرح ادا کر سکتے ہیں، اتفاقاً امام اہل سنتؒ اس وقت لکھنؤ ہی میں موجود تھے، تو حضرت

(۱) حضرت شاہ عبداللہ ابوالخیر فاروقی دہلوی نقشبندی مجددیؒ (م ۱۳۴۱ھ) ایک عالی مرتبت بزرگ اور صاحب سلسلہ شیخ تھے، آپ اپنے وقت میں مرجع الخلائق کی حیثیت رکھتے تھے، مشائخ عصر آپ کی خدمت میں حاضری کو اپنے لئے باعث سعادت سمجھتے اور اصلاح باطن کے لئے مسلسل حاضر ہوتے تھے۔

(۲) مولوی مقبول احمد بن غضنفر علی (م ۱۹۲۱ء) دہلی کے ایک سنی گھرانہ میں پیدا ہوئے، مگر سات سال کی عمر میں والدہ کی وفات ہو گئی جس کی وجہ سے بعض شیعہ معلمین کے زیر تربیت آ گئے اور انہیں کی صحبت کے اثر سے شیعہ ہو گئے، ان کی شہرت اپنے زمانہ میں ایک مقرر کی حیثیت سے تھی، یہ اپنی تقریروں میں کھل کر اشتعال انگیزی کرتے تھے اور فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے تھے، اہل سنت و جماعت کو مناظرہ کا چیلنج کرتے اور تبرے بازی ان کا خاص مشغلہ تھا، انہوں نے شیعی عقائد کے اعتبار سے قرآن مجید کا ایک ترجمہ بھی لکھا جو آج بھی شیعی حلقہ میں پسند کیا جاتا ہے۔

استاذ نے آپ کے سامنے پوری صورت حال رکھی اور فرمائش کی کہ آپ مستقل طور پر لکھنؤ آجائیں اور اہل حق کی جانب سے مدافعت کا کام سنبھال لیں، حالات کی نزاکت کے پیش نظر آپ نے لکھنؤ آجانے کا فیصلہ کرلیا، مولوی مقبول احمد حسب سابق لکھنؤ آئے اور تبرے بازی اور طعن و تشنیع سے بھرپور مجلسیں منعقد کیں، اور اہل حق کو مناظرہ کا چیلنج دیا تو امام اہل سنتؒ نے کہلا بھیجا کہ میں مناظرہ کے لئے تیار ہوں آپ وقت مقرر کرلیں، مولوی مقبول احمد مناظرہ کیا کرتے وہ فوراً دوسرے اسفار کا بہانا بنا کر لکھنؤ سے روانہ ہوگئے۔

امام اہل سنت کا خطاب

حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحبؒ نے جب امام اہل سنت کو اس کار عظیم کے لئے منتخب کیا تو حضرت کے بعض شاگردوں (جو امام اہل سنت کے معاصر تھے) نے کہا کہ ہم خدام تو ہر حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہیں، پھر مولانا عبدالشکور صاحب کو بلانے کی کیا ضرورت ہے، اس پر حضرت سخت چیں بجبیں ہوئے اور فرمایا: ''ہاں میں نے اسی کام کے لئے انہیں بلایا ہے، وہ اس معاملہ میں ہم اہل سنت کے امام ہیں''۔ مولانا کا یہ جملہ آگے چل کر ایک تاریخی حقیقت ثابت ہوا، اور اتنا مشہور و مقبول ہوا کہ نام کا ایک جزو ہوگیا۔

مدرسہ عالیہ فرقانیہ اور مدرسہ عالیہ عربیہ امروہہ سے تعلق

لکھنؤ آنے کے بعد حضرت الاستاذ نے آپ کو مدرسہ عالیہ فرقانیہ میں مدرسی کی پیش کش کی جس کو آپ نے قبول فرمالیا، یہاں آپ درس و تدریس کے ساتھ فتویٰ نویسی کی خدمات بھی انجام دیتے تھے، لیکن کچھ مدت کے بعد تصنیف و تالیف کی مشغولیات کے سبب آپ نے استعفیٰ دے دیا، کچھ عرصہ بعد امروہہ (جہاں شیعوں کا بڑا زور تھا) میں مدرسہ عالیہ

عربیہ امروہہ کا قیام عمل میں آیا تو صدر مدرسی کے لئے آپ کا نام پیش ہوا، آپ نے اس پیش کش کو قبول فرمالیا، لیکن کچھ دنوں بعد لکھنؤ کی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے وہاں سے بھی استعفیٰ دے دیا اور لکھنؤ میں مستقل مقیم ہوگئے۔

علم الفقہ

امام اہل سنتؒ کو تصنیف و تالیف سے شروع ہی سے مناسبت رہی، تعلیم مکمل ہونے کے فوراً بعد آپ نے ایک ماہانہ علمی رسالہ ''علم الفقہ'' کے نام سے جاری کیا جس کی اشاعت مسلسل چھ سال تک ہوتی رہی، یہ اردو زبان میں علم فقہ کا پہلا رسالہ تھا، حتیٰ کہ ''بہشتی زیور'' جیسی مشہور کتاب بھی اس کے بعد پایۂ تکمیل کو پہنچی، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ[1] نے ''بہشتی گوہر'' کے ماٰخذ میں اس رسالہ کو بھی شامل کیا ہے، اہل علم کے درمیان امام اہل سنت کے تعارف کا پہلا ذریعہ ''علم الفقہ'' تھا جو آج ایک مفصل کتاب کی صورت اختیار کر چکا ہے، اس کو چھ حصوں میں منقسم کیا گیا ہے، حصۂ اول طہارت، حصۂ دوم نماز، حصۂ سوم روزہ، حصۂ چہارم زکوٰۃ، حصۂ پنجم حج و زیارت، حصۂ ششم نکاح کے متعلق ہے۔

رسالہ ''النجم'' اور اس کے عمدہ اثرات

جب شیعوں کی طرف سے لکھنؤ میں فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کی کوشش کی جارہی تھی اور رسائل و جرائد میں تبرے سے بھرپور مضامین نشر ہوتے تھے، اس وقت دفاع حق کے

(۱) مولانا اشرف علی تھانوی (۱۸۶۳ء-۱۹۴۳ء) کی ابتدائی تعلیم میرٹھ اور تھانہ بھون میں ہوئی، پھر دار العلوم دیوبند تشریف لائے اور پانچ سال یہاں زیر تعلیم رہے، تعلیم سے فراغت کے بعد مدرسہ فیض عام کانپور میں مدرس ہوئے، پھر چودہ سال کے بعد اپنے وطن لوٹ گئے، اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خانقاہ کو از سرنو آباد کیا، اور اصلاح و تربیت و ارشاد کا سلسلہ شروع کیا، قرآن مجید کی تفسیر تحریر فرمائی، آپ کی تصانیف اور رسائل کی تعداد ۸۰۰ رتک ہے۔

لئے امام اہل سنتؒ نے رسالہ ''النجم'' کا اجراء کیا، اس اخبار کو عوام وخواص میں یکساں مقبولیت حاصل ہوئی، اور اس کے علمی مضامین نے شیعیت کے خیموں میں زلزلہ برپا کر دیا، جن باتوں کو وہ بربنائے تقیہ چھپاتے تھے اب سب کے سامنے عیاں ہوگئی تھیں، شیعی اخبار ورسائل ''النجم'' کا جواب دینے سے عاجز آچکے تھے، امام اہل سنت کی تمام تصنیفات سب سے پہلے ''النجم'' کے ذریعہ سے منظر عام پر آئیں، ''النجم'' کا طرز تحریر نہایت آسان، سلیس اور شگفتہ تھا، دقیق سے دقیق بحثوں کو بھی اس انداز سے تحریر کیا جاتا کہ کم پڑھے لکھے لوگ بھی آسانی سے سمجھ سکیں، ''النجم'' کا ایک خاص امتیاز یہ تھا کہ مناظرانہ مضامین اور شدید حملوں کا جواب دیتے وقت بھی اس کا لب ولہجہ نہایت مہذب، علمی اور سنجیدہ ہوتا تھا، اس رسالہ کے بہت اچھے اثرات مرتب ہوئے اور اس نے احقاق حق اور ابطال باطل کا فریضہ بدرجہ اتم ادا کیا۔

''دار المبلغین'' کا قیام اور اس کے مقاصد

امام اہل سنتؒ نے ۲؍ذی قعدہ ۱۳۳۲ھ کو لکھنؤ میں ادارہ ''دار المبلغین'' کی بنیاد رکھی، اس ادارہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ طلبہ کو قرآنی تعلیمات کو ترجیحی بنیاد پر صاف وسادے طریقہ سے عوام کے سامنے پیش کرنے کی تربیت دی جائے، اور علماء کی ایسی جماعت تیار کی جائے جو اسلام کی تبلیغ کا فریضہ انجام دینے کے ساتھ ساتھ عقائد حقہ کی نشر واشاعت، اور فرق باطلہ کے الزامات کا ''ترکی بترکی'' جواب دے سکیں، اس کے علاوہ ''دار المبلغین'' کے اغراض ومقاصد میں درج ذیل چیزیں بھی داخل تھیں:

(۱) اہل سنت کے اندر صحیح مذہبی واقفیت پیدا کر کے ان کو پابند مذہب بنانے کی سعی کرنا۔

(۲) غیر شرعی اعمال کی وجہ سے جو دینی، اخلاقی اور سماجی خرابیاں پیدا ہوگئیں ہیں اہل سنت کو ان سے محفوظ رکھنے کی جدو جہد کرنا۔

(۳) تحریر وتقریر کے ذریعہ اسلام کے مکارم ومحاسن کی تبلیغ واشاعت کرنا۔

شعبۂ تبلیغ کی خدمات

ان مقاصد کے حصول کے لئے سب سے پہلے آسان اور عام فہم ترجمہ قرآن کا سلسلہ شروع کیا گیا۔ اس کے علاوہ ادارہ نے ایک مستقل نصاب مرتب کیا جس سے طلبہ کو بڑا فائدہ حاصل ہوتا تھا، درس وتدریس کے علاوہ ''دار المبلغین'' کے جن شعبوں نے نمایاں خدمات انجام دیں ان میں شعبۂ تبلیغ سرفہرست ہے، ادارہ کے تربیت یافتہ مبلغین نے ملک وبیرون ملک میں جو خدمات انجام دیں، وہ اپنے اپنے میدانوں میں اساس کی حیثیت رکھتی ہیں، انہوں نے رد شیعیت اور ومدح صحابہؓ کا جو علم بلند کیا، صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ دیگر ممالک میں بھی لوگوں نے اس کے سایہ تلے مدارس ومکاتب اور تحریکوں کی بنیاد ڈالی، اور بے شمار لوگ راہ حق پر گامزن ہوئے۔

''دار المبلغین'' کی اقدامی خدمات

رفقائے ''دار المبلغین'' کی تقریروں اور جہد مسلسل کی وجہ سے تعزیہ داری اور رسوم وبدعات کو مسلم معاشرہ سے ختم کرنے میں بڑی مدد ملی لکھنؤ میں جب عیسائی اور مرزائی مشنریاں حرکت میں آئیں اور بھولے بھالے مسلمانوں کو اپنے جال میں پھنسا کر ان کے ایمان پر حملے شروع کئے تو ''دار المبلغین'' مقابلہ کے لئے سامنے آیا، اور مختلف جگہوں پر اپنی شاخیں قائم کیں، مواعظ کے لئے علماء کو متعین کیا، اور پورے ہفتہ مختلف مساجد میں

درس قرآن کا اہتمام کیا، جو آج بھی جاری ہے، امام اہل سنتؒ نے اس کے علاوہ "شہدائے اسلام" کے ۱۵/روزہ دینی، تبلیغی اور اصلاحی جلسوں کی بنیاد ڈالی، جس کے فوائد واثرات لامحدود ہیں، اور اس سلسلہ کو ایک صدی سے زائد کا عرصہ گزر چکا ہے، آج ملک و بیرون ملک میں بے شمار مقامات پر اسی عنوان پر دینی واصلاحی جلسے ہو رہے ہیں۔

امام اہل سنتؒ کی چند شہرۂ آفاق تصنیفات

امام اہل سنتؒ فراغت کے بعد ہی سے تصنیف وتالیف میں مشغول رہے، اور زبان وقلم کے ذریعہ سے اصلاح وتجدید کا کام کرتے رہے، آپ نے اپنے قلم کی طاقت سے باطل خیموں کو تہس نہس کر دیا، مسلمانوں کے اندر دینی شعور اور مذہب کے تئیں بیداری پیدا کی اور ان کے سامنے عظمت صحابہؓ، مقام اہل بیتؓ اور دین وشریعت کی تعلیمات کو واضح انداز میں پیش کیا اور انتہائی اہم کتابیں تحریر فرمائیں، چند کتابوں کے نام حسب ذیل ہیں:

تفسیر آیات خلافت وامامت (امام اہل سنتؒ کے تفسیری رسائل کا مجموعہ)

مختصر سیرت قدسیہ

سیرۃ الحبیب الشفیع من الکتاب العزیز الرفیع ملقب بہ مختصر سیرت نبویہ

علم الفقہ (چھ حصے)

سیرت خلفائے راشدینؓ

اردو ترجمہ اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابہؓ (۱۰ حصے)

ابوالائمہ کی تعلیمات

قاتلان حسینؓ کی خانہ تلاشی

شیعہ اور قرآن

تحفۃ الاسلام لجمیع الاقوام (اسلام میرا مذہب)

کتاب الصلاۃ

سلسلۂ نقشبندیہ کے آغوش میں پرورش

حسن اتفاق سے امام اہل سنتؒ بچپن ہی سے سلسلۂ نقشبندیہ کے بزرگوں سے کسی نہ کسی طور پر منسلک رہے، سب سے پہلے جس کا سایہ ملا وہ آپ کے والد ماجد مولوی حافظ ناظر علیؒ تھے جنھوں نے احسان وتزکیہ میں کمال حضرت شاہ عبدالسلام ہنسویؒ سے حاصل کیا، پھر وہ شخصیت جس کی تربیت نے آپ کو بلند وبالا مقام پر پہنچایا، یعنی حضرت مولانا سید عین القضاۃ صاحبؒ، وہ آپ پر بڑے مشفق ومہربان تھے، اور سلسلۂ نقشبندیہ میں شیخ موسیٰ جی ترکیسر[1] کے خلیفۂ ومجاز تھے، اسی طرح دہلی کے زمانۂ قیام میں بھی آپ کو نقشبندی سلسلہ کے بزرگ حضرت شاہ ابوالخیر دہلویؒ مل گئے چنانچہ وہاں حاضر ہونا امام اہل سنتؒ کا معمول تھا۔

---

(۱) شیخ موسیٰ جی ترکیسر (۱۲۵۴ھ-۱۳۰۹ھ) کا اسم گرامی موسیٰ جی بن حسین بن احمد رحمۃ اللہ علیہم ہے، آپ بچپن ہی میں یتیمی کے مرتبہ پر فائز ہوگئے، آپ کی تربیت والدہ ماجدہ کے ہاتھوں ہوئی، زمانہ رضاعت سے ہی آپ کی والدہ آپ کو حضرت مولانا نظام الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں لے جاتی رہیں، آبائی معاش زمینداری تھی، مگر کچھ ایسے اسباب پیش آئے کہ اکثر زمین تلف ہوگئی، چنانچہ آپ جنگل سے لکڑی لاتے اور اس کو بیچ کر گزارا فرماتے، آپ کی تعلیم زیادہ نہیں تھی، بس ضروری مسائل دینیہ سے واقف تھے، بزرگی کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز تھے، ارادت مندوں کا ہر وقت ہجوم رہتا تھا، بڑے بڑے مشائخ آپ سے نیاز حاصل کرنے کے لئے بے چین رہتے، آپ کو خلافت حضرت مولانا نظام الدین صاحبؒ سے تھی، آپ کا مفصل تذکرہ امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ نے ''کرامات موسویہ'' کے نام سے تحریر فرمایا ہے، جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

بیعت کا عجیب وغریب واقعہ

ان بزرگوں کی سرپرستی اور نگرانی حاصل رہی لیکن کسی سے بیعت نہیں ہوئے، شیخ کامل کی تلاش وجستجو ہمیشہ جاری رہی اور حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ اور حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ(۱) کی طرف دل مائل بھی ہوا لیکن بیعت کی نوبت نہ آسکی، بھوپال میں شاہ ابواحمد بھوپالی نقشبندی مجددیؒ(۲) سے بیعت کی سعادت حاصل ہوئی، بیعت کا واقعہ خود امام اہل سنت اس طرح تحریر فرماتے ہیں:

''اس خاکسار کے داخل سلسلہ ہونے کا واقعہ بھی عجیب وغریب ہے، ایک غیبی سامان پیش آیا کہ چاروناچار حضرت ممدوح کی خدمت میں حاضر ہوا، دیکھتے ہی بڑے لطف وکرم سے فرمایا کہ میں آپ کے آنے کے لئے دعائیں مانگا کرتا تھا، پھر نہایت لطف وکرم کے ساتھ یہ شعر زبان مبارک سے ادا فرمایا۔

---

(۱) فخر المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ(۱۲۶۹ھ-۱۳۴۶ھ) ایک نامور بزرگ عالم دین تھے، آپ کی ابتدائی تعلیم انبیٹھہ اور نانوتہ میں ہوئی پھر دارالعلوم کے قیام کے بعد آپ دیوبند آگئے، کچھ عرصہ یہاں تعلیم میں مشغول رہے پھر مظاہر علوم سہارنپور کے افتتاح کے بعد آپ وہاں چلے گئے اور وہیں سے فراغت حاصل کی، آپ نے اصلاحی تعلق قطب وقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے قائم کیا اور نہایت عزیمت اور صددرجہ استقامت کے ساتھ سلوک سے متعلق معمولات پورے فرمائے، یہی وجہ تھی کہ جب حج کے لئے تشریف لے گئے تو حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ نے تحریری خلافت سے نوازا اور اسی تحریر پر دستخط کر کے مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے بھی خلافت عطا کی۔

(۲) شیخ کامل مرشد وقت حضرت شاہ ابواحمد بھوپالی صاحبؒ (۱۸۴۳ء-۱۸۷۸ء) بھوپال میں پیدا ہوئے، اور ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی، چھ سال کی عمر میں والد کے سایہ سے محروم ہوگئے، جب سن شعور کو پہنچے تو مدینہ منورہ جاکر اپنے حقیقی پھوپھا شاہ عبدالغنی مجددی سے کسب فیض کیا اور خلافت سے سرفراز ہوئے، حضرت کی پوری زندگی سنت نبوی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، اور ادعیہ مسنونہ کا بے حد اہتمام فرماتے تھے۔

وصل کی مانی تھیں کیا کیا منتیں
چھلے درگاہوں میں بندھواتے تھے ہم

شب کو بعد نماز عشاء اپنے پاس اس گنہگار کا بستر بچھوایا اور اس وقت اس ناچیز کو سنا کر مگر دوسروں سے مخاطب ہو کر کئی بار یہ شعر پڑھا۔

ہم نہ ہوئیں گے تو پھر پچھتائے گا
مفت تیرے ہاتھ سے جاتے ہیں ہم

اس ناچیز نے سمجھ لیا کہ مقصود میں ہی ہوں، زہے قسمت، مگر پھر بھی بمقتضائے احتیاط نماز استخارہ پڑھی، دل کو حضرت ممدوح کی طرف مائل پا کر نماز فجر سے پہلے عرض کیا کہ حضرت مجھے بھی داخل سلسلہ کر لیجئے اس پر بڑی عنایت اور دل ربا تبسم کے ساتھ فرمایا کہ بہت اچھا، نماز فجر پڑھ لیجئے۔

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو وہ دھری رہی"[1]

خلافت واجازت

اس واقعہ کے بعد حضرت شاہ ابو احمد بھوپالیؒ دو سال تک اپنے فیوض برکات سے مریدین و متوسلین کو فائدہ پہونچاتے رہے، اس دوران، وفات سے کچھ عرصہ قبل لکھنؤ کا سفر کیا، اس سفر میں کاکوری بھی تشریف لے گئے اور اسی سفر میں امام اہل سنتؒ کو خلافت واجازت دے کر سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کا وارث اور امین بنا دیا۔

---

(۱) امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ حیات وخدمات، ص: ۱۹۰/۱۹۱۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو امام اہل سنتؒ کی خدمات کا اعتراف

امام اہل سنتؒ کی ذات اپنے وقت میں مرجع الخلائق شخصیت کی حامل تھی، اور تمام اہل علم ودانش کو آپ سے بڑا قرب اور لگاؤ تھا، آپ کی بے انتہا مقبولیت کے باوجود سادگی اور تواضع وانکساری آپ کو امتیازی شان عطا کرتی تھی، آپ کی پوری زندگی علمی کاموں میں گزری، آپ کی نوک قلم سے جو عمدہ تخلیقات وجود میں آئیں، علمی حلقوں میں ان کی بڑی پذیرائی ہوئی، یہ تحقیقات عام علماء کے لئے تو کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں تھیں، مشائخ وقت بھی ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور اپنے مریدین ومتوسلین کو بھی استفادہ کی ترغیب دیتے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی(1) علیہ الرحمہ بھی امام اہل سنتؒ کے بڑے معترف اور ان کی علمی خدمات وتجدیدی کارناموں کے بڑے قدر دان تھے (تفصیلات آئندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں) آپ کی وفات حسرت آیات کے موقع پر مفکر اسلام تحریر فرماتے ہیں:

> مولانا اس وقت دنیائے اسلام کے ممتاز ترین علماء ومصلحین اور ان چند برگزیدہ شخصیتوں میں سے تھے جن سے اللہ تعالیٰ نے تاریخ اسلام کے مختلف زمانوں میں، خاص اصلاحی اور تجدیدی کام لیا ہے۔ وہ علاوہ اس کے کہ ایک بڑے متبحر عالم اور عمیق النظر فقیہ تھے، ایک کامیاب مصنف اور

(1) مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ (۱۹۱۳ء-۱۹۹۹ء) نے ایسے خاندان میں آنکھیں کھولیں جو ایک طویل زمانہ سے علمی ودینی خدمات انجام دے رہا تھا، اور شاید ہی کوئی صدی ایسی گزری ہو جس میں اس نے کوئی مصلح نہ پیدا کیا ہو، مولانا کے والد حضرت مولانا عبدالحی حسنیؒ ہندوستان کے ممتاز مؤرخ تھے، جب آپ کی عمر ۹ ربرس ہوئی تو والد صاحب کا انتقال ہوگیا، چنانچہ آپ کی تعلیم وتربیت آپ کے برادر اکبر مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی نگرانی میں ہوئی، مولانا ایک طرف ممتاز مفکر ومصلح، دوسری طرف کامیاب معلم ومربی، اور تیسری طرف باثر صاحب قلم اور صاحب اسلوب ادیب تھے۔

متکلم، صاحب سلوک اور صاحب سلسلہ شیخ اور خوش بیان مقرر بھی تھے۔ (۱)

شیخ وقت حضرت مولانا عبدالقادر رائپوریؒ کے یہاں امام اہل سنت کا مقام

مفکر اسلامؒ کو امام اہل سنت سے غیر معمولی تعلق اور بے انتہا محبت وعقیدت اس لئے بھی تھی کہ ان کے اساتذہ اور شیخ اور ان کے مادر علمی دار العلوم ندوۃ العلماء کے بانیوں کے یہاں امام اہل سنت کا مقام بڑا بلند تھا، بعض حضرات کے تاثرات یہاں پیش کئے جاتے ہیں، مفکر اسلامؒ اپنے شیخ، شیخ وقت حضرت مولانا عبدالقادر رائپوریؒ (۲) کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

> حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنویؒ سے بھی خاص محبت ومناسبت تھی کہ حضرت کو صحابۂ کرامؓ سے عشق تھا اور رفض سے بڑی نفرت وعدم مناسبت، اور اللہ تعالی نے مولانا عبدالشکور صاحب سے اس سلسلہ میں بڑا کام لیا، حضرت نے ان کے بہت سے رسائل اہتمام سے پڑھوا کر سنے تھے۔

آگے لکھتے ہیں:

> راؤ فضل الرحمٰن صاحب نے اخبار پڑھتے ہوئے یہ خبر سنائی کہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی کا انتقال ہوگیا، اس خبر کے سنتے ہی، فرمایا ''اوہو۔ إنا لله وإنا إليه راجعون'' حضرت پر اس قدر اثر ہوا کہ اٹھ

---

(۱) امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ حیات خدمات، ص: ۸۳۴۔

(۲) حضرت شاہ عبدالقادر رائپوریؒ (۱۸۷۳ء-۱۹۶۲ء) سرگودھا پنجاب میں پیدا ہوئے، اور سلوک کی تعلیم حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری سے حاصل کی آپ اپنے وقت کے شیخ کامل تھے، بڑے بڑے مشائخ آپ کی طرف رجوع فرماتے تھے، آپ کی بے نفسی وتواضع وانکساری لائق دید ہی نہیں بلکہ قابل تقلید تھی، آپ کی پوری زندگی اصلاح وتربیت میں گزری اور اللہ تعالی نے آپ سے بڑا کام لیا، آپ کے فیض یافتہ افراد نے بے مثال دینی خدمات انجام دیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو بھی آپ سے ارادت مندانہ تعلق تھا اور آپ سے اجازت وخلافت بھی تھی۔

کر بیٹھ گئے، حالانکہ بغیر دو آدمیوں کے سہارا دئے ہوئے اٹھنا مشکل ہوتا تھا، مگر اس خبر سے اتنا اثر پڑا کہ بلا کسی کی مدد کے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ (۱)

بانیانِ ندوہ اور فکرِ ندوہ کے امینوں کے نزدیک امام اہل سنت کا مقام

امام اہل سنتؒ کے متعلق بانیان و نظماء اور مدرسین ندوہ کے جو تاثرات کتابوں میں درج ہیں، انہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ علماء ندوہ کے نزدیک ان کا کیا مقام و مرتبہ تھا، اور معاصر ہونے کے باوجود ان کی علمی، دینی اور تحریکی خدمات کا اعتراف کیسے کھلے دل سے کرتے تھے، اور ان کی مجددانہ شان بیان کرنے میں تھوڑا بھی تکلف نہیں ہوتا تھا، چنانچہ چند ایسی شخصیات کے تاثرات پیش کئے جا رہے ہیں جو ندوۃ العلماء کی شان ہیں اور فکرِ ندوہ کی اساس۔

حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ تحریر فرماتے ہیں:

از فقیر محمد علی رحمانی کان اللہ لہ

''تمام برادرانِ دینی، احباب، مخلصین اور مریدین سلسلۂ عالیہ رحمانیہ کو بعد سلام مسنون معلوم ہو کہ آج کل روافض کی طرف سے جو حملے مذہب اہل سنت پر ہو رہے ہیں وہ بہت زیادہ قابل توجہ ہیں، ان کے پچیس چھبیس رسائل و اخبار رد اہل سنت میں نکل رہے ہیں، اور ان کی چھوٹی بڑی کتابیں بھی روزمرہ نکلا کرتی ہیں، ان کے واعظین بھی جابجا گشت کر کے لوگوں کو بہکا رہے ہیں، اور ہندوستان بھر میں سوا میرے محب مخلص جامع الفضائل مولانا عبد الشکور صاحب لکھنوی کے مذہب روافض پر کامل عبور رکھنے والا اور ان کے

---

(۱) سوانح حضرت مولانا عبد القادر رائپوریؒ، ص: ۳۱۷۔

اعتراضات کا شافی جواب دینے والا کوئی دوسرا معلوم نہیں ہوتا، انہیں کا ایک رسالہ ''النجم'' ہے جو لکھنؤ سے ہر مہینے میں دو بار شائع ہوتا ہے، اور تمام اہل سنت کی طرف سے فرض کفایہ ادا کر رہا ہے، حق یہ ہے کہ رد روافض میں النجم بے نظیر ہے، علاوہ رد روافض کے کبھی کبھی دوسرے مذاہب باطلہ کا رد اور خود مسلمانوں کی مذہبی معلومات اور معارف قرآنیہ کا ذخیرہ بھی اس میں شائع ہوتا رہتا ہے، لہٰذا یہ فقیر اپنے محبین و مخلصین سے متوقع ہے کہ وہ رسالہ مذکورہ کے خریدار ہو کر اس دینی خدمت میں مدد دیں گے، فقیر ان سے نہایت خوش ہوگا۔''(۱)

حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ(۲) لکھتے ہیں:

''انہوں نے شیعوں کے عقائد، ان کے خیالات اور ان تمام چیزوں سے جن کو ان لوگوں نے اپنے مذہبی کتابوں مین درج کر رکھا تھا، پردہ ہٹایا، جن سے اخص الخواص حضرات کے سوا عوام اور عام علماء (اب تک) ناواقف تھے، اسی لئے وہ ہند اور بیرون ہند میں اس خاص علم میں یکتائے روزگار اور امام وقت تسلیم کر لئے گئے، اس موضوع خاص میں ان کے معاصرین علماء میں کوئی بھی ان کا مد مقابل اور ہم پلہ نہیں ہو سکا سوائے اس

---

(۱) امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقی حیات وخدمات، ص: ۱۴۳۔

(۲) حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ (۱۸۶۹ء-۱۹۲۳ء) ہندوستان کے مشہور عالم، مؤرخ، ادیب اور ندوۃ العلماء کے ناظم تھے، ابتدائی تعلیم ہنسوہ اور رائے بریلی میں حاصل کی اور علوم عالیہ کے لئے مختلف شہروں کا سفر کیا، ۲۵ رسال کی عمر سے تحریک ندوۃ العلماء سے وابستہ ہوگئے اور بڑی خدمات انجام دیں، آپ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے والد اور نزھۃ الخواطر کے مصنف تھے۔

کے جس کا علم اللہ ہی کو ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ بے گنتی و بے شمار لوگوں کو نفع پہونچایا، انہوں نے ان تمام رسوم بد کا خاتمہ کیا جو ہندوستان میں شیعوں کے اثر سے پھیلی ہوئی تھیں۔"(۱)

علامہ شبلی نعمانیؒ(۲) فرماتے ہیں:

"مولانا موصوف حنفی و اہل سنت و جماعت ہیں، کوئی اس میں شک وشبہ نہیں ہے کہ ان کی ہستی اسلامی دنیا کے لئے نعمت خداوندی ہے۔"(۳)

علامہ سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں:

"جناب مولانا عبدالشکور صاحب ایک صالح و متقی و فاضل عالم اہل سنت واحناف ہیں، اور اس عصر میں ان کا وجود اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں پر احسان عظیم ہے۔"(۴)

علامہ سید سلیمان ندویؒ جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں زیر تعلیم تھے، اس وقت امام اہل سنت وہاں مدرسی کی خدمات انجام دے رہے تھے، اسی لئے سید صاحبؒ کو امام اہل سنت سے نیازمندانہ تعلق تھا، اور امام اہل سنت بھی ان کا بڑا خیال فرماتے تھے، ان کی خدمت میں حاضری

(۱) امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ حیات وخدمات، ص:۸۲۹۔

(۲) علامہ شبلی نعمانیؒ (۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء) اعظم گڑھ ضلع کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر ہی مولانا فاروق چریاکوٹی سے حاصل کی، آپ نے وکالت کا امتحان بھی پاس کیا اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر بھی رہے، اور اپنی علمی وتحقیقی زندگی کا آغاز وہیں سے کیا، ایک عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم بھی رہے، علماء و محققین کے لئے دارالمصنفین قائم کروایا، آپ نے بہت سی بہترین کتابیں تصنیف فرمائیں، جو آج بھی مفید و نافع ہیں۔

(۳) امام اہل سنتؒ کے متعلق ۱۳۵ مستند و محقق علماء کی رائیں، ص:۷۔

(۴) ایضاً۔

دینا سید صاحبؒ کے معمولات میں سے تھا، مولانا سید علی مطہر نقوی امروہویؒ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی امام اہل سنتؒ کی خدمت میں حاضری کا واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دیوبند سے فراغت کے بعد میں نے اپنے اندر مناظرانہ صلاحیت پیدا کرنے کی غرض سے ''دارالمبلغین لکھنؤ'' میں داخلہ لیا، اور چھ ماہ علامہ لکھنوی سے فیضیاب ہوتا رہا، میرے چھ ماہ کی رہائش کے دوران ''دارالمبلغین'' میں میری موجودگی ہی میں سید سلیمان ندویؒ دو مرتبہ تشریف لائے، سید صاحبؒ جب بھی تشریف لاتے، مولانا سلسلۂ درس بند کر کے علاحدہ دوسرے کمرے میں سید صاحب کے پاس جا بیٹھتے، علم وبصیرت کے دونوں اماموں کی یہ علمی نشست کئی کئی گھنٹہ جاری رہتی، درس کا تمام وقت ملاقات کے حوالہ ہوجاتا تھا''۔ (۱)

اسی طرح علامہ سید سلیمان ندویؒ کو امام اہل سنتؒ کی تحریک و مشن سے بھی گہرا تعلق تھا، اور آپ تحریک مدح صحابہؓ کی اہم اور خصوصی میٹنگوں میں بھی شریک ہوتے، اور تمام تجاویز پر نظر فرماتے اور اپنی آراء بھی پیش کرتے تھے۔

ان کے علاوہ بھی ندوۃ العلماء اور مفکر اسلامؒ کے متعلقین کی ایک لمبی فہرست ہے، جن کو امام اہل سنتؒ سے گہرا تعلق تھا، اور وہ آپ کی فکر سے پوری طرح متفق بلکہ اس کے مؤید تھے۔

ابوالحسن علی فاروقی

۲۰۲۰/۱۲/۱۶ء

---

(۱) تاریخی مضامین، ص:۸۔



امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنویؒ

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

کی تحریروں میں



امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ

شخصیت وانفرادیت اور تجدیدی واصلاحی کارنامہ

از: مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولانا شاہ سید عبدالسلام ہنسویؒ سے تعلق

مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کے ہمارے خاندان اور اس کے بزرگوں سے بڑے گہرے روحانی روابط تھے، ان کے والد محترم مولوی ناظر علی صاحب تحصلیدار حضرت مولانا سید عبدالسلام صاحب ہنسوی (خلیفہ حضرت شاہ احمد سعید [۱] صاحب مجددی دہلوی) کے مرید ومجاز اور عاشق صادق تھے، مولانا سید عبدالسلام صاحب میرے والد ماجد مولانا سید حکیم عبدالحئی صاحب کے ماموں تھے، وہ اپنے وقت کے مشائخ کبار اور اہل اللہ میں سے تھے، شاہ احمد سعید صاحب اور ان کے بھائی شاہ عبدالغنی صاحب [۲] کے ہندوستان

(۱) شاہ احمد سعید فاروقی مجددی (۱۸۰۲ء-۱۸۶۰ء) سلسلۂ نقشبندیہ کے معروف بزرگ اور حضرت مجدد الف ثانی کے خانوادہ کے چشم وچراغ تھے، آپ کی بزرگی، للّٰہیت وتقوی اور پرہیزگاری معروف تھی، اہل دل آپ کے پاس حاضری دیتے اور آپ کے بتائے ہوئے معمولات پر عمل کرتے تھے، آپ نے اپنے وقت میں رشد وہدایت کا جو چراغ روشن کیا اس نے مختلف مقامات کو منور کر دیا اور آپ کے ذریعہ سے بے شمار لوگوں کو اللہ کی معرفت حاصل ہوئی، آپ نے ارادت کا تعلق شاہ غلام علی دہلویؒ سے قائم کیا اور انہیں سے مجاز وخلیفہ ہوئے۔

(۲) شاہ عبدالغنی مجددی (۱۸۱۹ء-۱۸۷۸ء) کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے، اہل علم جانتے ہیں کہ ان کا

سے ہجرت کر جانے کے بعد سلسلۂ مجددیہ نقشبندیہ میں مولانا عبدالسلام صاحب سے بلند پایہ اور عالی مرتبت شیخ اس وقت ہندوستان میں نظر نہیں آتا، والغیب عند اللہ، اسی کا نتیجہ تھا کہ جب اس سلسلہ کے متوسلین نے ہندوستان سے شاہ عبدالغنی صاحب کو خط لکھا کہ ''آپ دونوں بھائیوں کے چلے جانے کے بعد دہلی (چتلی قبر) کی مجددی خانقاہ جس کی مسند ارشاد پر کبھی حضرت مرزا مظہر جان جاناں (۱)، شاہ غلام علی (۲) اور آخر میں حضرت شاہ احمد سعید رونق افروز تھے، اب سونی پڑی ہے، اور اس کی مسند ارشاد خالی ہے، تو شاہ صاحب نے مدینہ منورہ سے لکھا کہ تم ہنسوہ (۳) سے مولانا عبدالسلام صاحب کو لے جا کر اس مسند پر بٹھاؤ، اب وہی اس کے اہل ہیں، میں نے اس خط کا جواب مولانا عبدالسلام صاحب کے ہاتھ کا لکھا ہوا، ہنسوہ میں دیکھا ہے، جس میں انہوں نے اس اہم اور رفیع ذمہ داری کو قبول کرنے سے معذرت کی ہے، مولانا نے جواب لکھا کہ ''میں کسی طرح اس کے قابل نہیں ہوں'' اور انہوں نے پوری زندگی اسی قصبہ میں فقر وتوکل، تجرید وتفرید، ذکر وعبادت اور

کیا مقام ومرتبہ تھا اور کیسی برگزیدہ شخصیت کے حامل تھے، آپ کے ذریعہ سے دین اسلام کے ایسے محافظ تیار ہوئے جنہوں نے مختلف زمانوں اور مختلف میدانوں میں دین کی سربلندی کے لئے نمایاں خدمات انجام دیں، آپ خاندان ولی اللہی کے علمی وارث اور ان کی فکر کے امین تھے۔

(۱) حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ (۱۶۹۹ء-۱۷۸۱ء) قطب وقت اور مصلح ومربی تھے، سادات علوی میں سے تھے، تصوف کے میدان میں اللہ تعالی نے آپ سے بہت کام لیا، بڑے بڑے مشائخ آپ کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے اور سلوک کی منازل طے کیں۔

(۲) شاہ غلام علی دہلویؒ (۱۷۴۳ء-۱۸۲۴ء) سلسلہ نقشبندیہ کے نامور صوفی بزرگ تھے، آپ حضرت مرزا مظہر جان جاناں سے بیعت اور انہیں کے مجاز وخلیفہ تھے، آپ کے زمانہ میں بھی خانقاہ مظہریہ کو مرکزی حیثیت حاصل رہی اور وہاں سے علم وعرفاں کی نہریں جاری ہیں۔

(۳) ہنسوہ ضلع فتح پور کا ایک قصبہ ہے، جو شہر سے مشرق کی جانب ۸-۱۰ میل کے فاصلہ پر واقع ہے، یہاں سادات حسینی واسطی کی ایک شاخ ساتویں صدی ہجری سے مقیم ہے۔

ارشادوتربیت میں گزاردی، اور۳؍شوال ۱۲۹۹ھ کو۵۰؍سال کی عمر میں سفرآخرت اختیار کیا اور وہیں اپنے خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئے، ان کے مناقب وفضائل کے لئے ایک مستقل کتاب درکار ہے۔

تسمیہ خوانی اوراس کے اثرات:

مولانا عبدالشکور صاحب کے والد (مولوی ناظر علی صاحب) اپنے شیخ مولانا سید عبدالسلام صاحب کی عقیدت میں سرشار تھے، انہوں نے بچپن میں ان کی زیارت بھی کی تھی، اور مولانا ہی نے ان کی تسمیہ خوانی کرائی، مجھ سے کئی بار کہا کہ میرے ذہن میں حضرت کا حلیہ اس طرح مرتسم ہے کہ اگر میں مصور ہوتا تو ان کی ہو بہو تصویر کاغذ پر کھینچ دیتا، مولانا ان کی فنائیت وبے نفسی ان کی تواضع وخاکساری اور ان کی مقبولیت عنداللہ کے واقعات مزے لے لے کر بیان کرتے، اس وقت معلوم ہوتا کہ ان کے کام ودہن بھی اس سے لذت یاب ہورہے ہیں، مولانا روایت کرنے میں بڑے محتاط تھے، وہ جچے تلے لفظ بولتے، حشو وزوائد کا ان کے یہاں کچھ کام نہ تھا، وہ مبالغہ اور تکلف سے مبرا تھے، آج جن الفاظ میں جو روایت بیان کی دس برس بعد بھی تقریباً انھی الفاظ میں ان سے سن لیجئے گا۔ مولانا شاہ عبدالسلام کی عقیدت وعظمت کا ایسا غلبہ تھا کہ کسی بزرگ کا ان کے سامنے تذکرہ کیجئے اور کسی کے متعلق دریافت کیجئے وہ چند لفظ کہہ کر مولانا عبدالسلام صاحب کا ذکر چھیڑ دیتے ان کا حال اس بارے میں وہی تھا جو کسی عربی شاعر نے بیان کیا ہے۔

أعد ذكر نعمان لنا أن ذكره

هو المسك ما كررته يتضوع

میری پہلی زیارت:

میری پہلی زیارت ۱۹۲۷ء کی گرمیوں میں ہوئی، خاندانی تعلقات کی بنا پر یہ بات ہر طرح قرین قیاس ہے کہ اس سے پہلے کئی بار ان کو دیکھا ہو، لیکن اب حافظہ پر زور ڈالنے سے بالکل یاد نہیں آتا کہ اس سے پہلے ان کی زیارت ہوئی ہے، غالباً جون کا مہینہ تھا، خواجہ عبدالحی فاروقی (۱) گرمی کی چھٹیوں میں جامعہ سے لکھنؤ اپنے رفیق درس ڈاکٹر عبدالعلی (۲) صاحب کے یہاں آئے ہوئے تھے، اسی زمانہ میں میں نے ان سے قرآن مجید کا کچھ حصہ پڑھا، انہوں نے بھائی صاحب سے مولانا عبدالشکور صاحب کی ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا، بھائی صاحب نے مجھے ان کے ساتھ کردیا، ہم دونوں پاٹا نالہ گئے، وہاں ایک چھوٹی سی مسجد میں جو مولانا کے مکان کے قریب ہے عصر کی نماز کے بعد ملاقات ہوئی، جسم ولباس کسی سے نہیں معلوم ہوتا تھا کہ یہ وہ مولانا عبدالشکور صاحب ہیں، جن کا لکھنؤ میں طوطی بولتا ہے، اور جن کی شہرت ہندوستان سے لے کر ایران تک پھیلی ہوئی ہے، اور جو اس وقت اپنے

(۱) خواجہ عبدالحی فاروقی صاحب ایک نیک صفت انسان تھے، آپ ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کے رفیق درس اور قریبی دوست تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد آپ جامعہ ملیہ اسلامیہ سے وابستہ ہوگئے، جامعہ کی مجلس امناء نے جب ادارہ کی ذمہ داری سے بے بسی ظاہر کی اور یہ امانت نوجوانان امت کے سپرد کی تو ان نوجوانوں میں ایک نام خواجہ صاحب کا بھی تھا، آپ نے ملک بھر کا دورہ کیا اور ادارہ کو ممبران فراہم کئے، آپ ایک عرصہ تک شعبۂ دینیات کے ناظم بھی رہے۔

(۲) حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ (۱۸۹۳ء-۱۹۶۱ء) کی پیدائش ہنسوہ ضلع فتحپور میں ہوئی، قرآن مجید حفظ کرنے کے ابتدائی تعلیم والد ماجد کی ہدایات کے مطابق ہوئی، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا، پھر تکمیل حدیث کے لئے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، وہاں سے فارغ ہونے کے بعد طب کی تعلیم حاصل کی اور اس میں بھی ایسی مہارت پیدا کرلی کہ اطباء کے یہاں معروف ہوگئے اسی کے ساتھ انگریزی کے امتحانات بھی اعلیٰ نمبرات سے پاس کئے، آپ ایک لمبے عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم بھی رہے۔

موضوع خاص میں حضرت شاہ عبدالعزیز(۱) اور مولانا حیدر علی(۲) فیض آباد کے جانشین ہیں، تھوڑی دیر بیٹھ کر ہم لوگ واپس آ گئے۔

مواعظ کا سلسلہ:

پھر وہ زمانہ آیا کہ مولانا نے اہل سنت کو صحابہ کرامؓ کے مقام، ان کے حقوق اور ان کے فضائل و مناقب سے واقف کرانے اور ان اثرات کو زائل کرنے کے لئے مواعظ کا سلسلہ شروع کیا، جو ہندوستان میں عہد مغلیہ کے دور آخر میں علی العموم اور نوابانِ اودھ کی سلطنت کے اثر سے لکھنؤ اور اس کے اطراف میں علی الخصوص اہل سنت کے ذہنوں، مزاجوں اور ان کے تمدن و معاشرت میں دخیل و جاری و ساری ہو گئے تھے، ان مواعظ نے لکھنؤ اور اس کے اطراف میں اصلاح و انقلاب کا وہ کام کیا جو ان کے ان مناظروں نے اور مناظرانہ رسائل نے نہیں کیا، جن کی ہندوستان کے سنی حلقوں میں دھوم مچی ہوئی ہے، ان کے یہ مواعظ بڑے مؤثر اور دل پذیر ہوتے، نپے تلے الفاظ، سادہ زبان، مغز کی بات، اندرونی جذب، غرض کہ

(۱) حضرت شاہ عبدالعزیز فاروقی محدث دہلویؒ (۱۷۴۶ء-۱۸۲۳ء) شاہ ولی اللہ فاروقی محدث دہلوی کے فرزند اکبر تھے، آپ نہایت وسیع العلم اور حاضر دماغ تھے، باوجود اس کے کہ اوائل عمر سے ہی مختلف امراض نے آپ کو جکڑ لیا تھا، متعدد کتابیں تصنیف کیں اور بہت سی کتابوں کا املا کرایا، آپ اپنی علمی شان اور تقوی و پرہیزگاری کی وجہ سے اپنے والد ماجد کے حقیقی جانشین قرار دیے گئے۔

(۲) حضرت مولانا حیدر علی فیض آبادیؒ (م ۱۸۸۱ء) زبردست متکلم، مناظر، مفسر اور مصنف تھے، آپ کی ابتدائی تعلیم لکھنؤ کی شیعہ درسگاہوں میں ہوئی، اعلی تعلیم کے لئے آپ دہلی تشریف لے گئے اور مختلف اساتذہ سے کسب فیض کیا، شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کی مجالس میں بھی شرکت فرماتے رہے، آپ نے بے شمار کتابیں تحریر فرمائیں، خاص طور پر رد شیعیت پر آپ کا کام نہایت علمی اور اہم ہے، اسی طرح قرآن مجید کی تفسیر بھی آپ کے قلم رواں سے وجود میں آئی، افسوس کہ آپ کی اکثر کتب ۱۸۵۷ء کے موقع پر ضائع ہو گئیں۔

''ہر چہ از دل می خیزد و بر دل می ریزد'' کے مصداق، صحابہ کرامؓ کے فضائل وحقوق بیان کرنے کے ساتھ مولانا قرآن مجید کے محفوظ اور غیر محرف ہونے اور اس کے اعجاز پر بھی روشنی ڈالتے، ان کی تقریروں میں نماز کی تبلیغ کا عنصر ضرور ہوتا، خدا ہی کو معلوم ہے کہ کتنے بندگان خدا کو ان مواعظ سے نفع پہنچا اور ان کی زندگیاں بدل گئیں، کم سے کم ہمارے شہر لکھنؤ میں حضرت سید احمد شہید (۱) کے دورہ ۱۲۳۴ھ کے بعد ایسی اصلاحی وانقلابی لہر نہیں آئی، چکمنڈی جو مولانا کے معتقدین کا خاص محلہ ہے، چونکہ ہمارے محلہ سے قریب تھا، اور دونوں محلوں میں ایک ہی (قریشی) برادری رہتی ہے، جو مولانا کی خاص طور سے حلقہ بگوش اور ان کی تحریک ودعوت میں پیش پیش تھی، اسلئے مجھے ان اثرات کے مطالعہ کرنے اور مولانا کی شخصیت کی دلآویزی اور مواعظ کی دلپذیری سے واقف ہونے کا زیادہ موقع ملا۔

تحریک مدح صحابہؓ کا آغاز:

پھر وہ وقت آیا کہ لکھنؤ میں ''مدح صحابہ'' کی تحریک شروع ہوئی اور ۱۹۳۹ء میں مولانا حسین احمد مدنی (۲) صدر جمعیۃ العلماء اور شیخ الحدیث وصدر المدرسین دار العلوم

(۱) حضرت سید احمد بن عرفان شہیدؒ (۱۲۰۱ھ-۱۲۴۶ھ) کی پیدائش دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں ہوئی، آپ اپنے وقت کے مجدد اور مصلح تھے، آپ کے ذریعہ سے بے شمار رسوم وبدعات کا خاتمہ ہوا، آپ نے بہت سی ایسی خدمات انجام دیں جو تجدیدی شان کی حامل تھیں، رد فرق باطلہ اور خاص طور پر رد شیعیت پر آپ کی خدمات نمایاں ہیں آپ کا سب سے بڑا کارنامہ تحریک جہاد ہے۔

(۲) شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (۱۸۷۹ء-۱۹۵۷ء) صوبۂ اتر پردیش کے ایک ضلع اناؤ میں پیدا ہوئے، ابتدائی کتابیں گھر پر پڑھیں، اعلی تعلیم کے لئے دار العلوم دیوبند تشریف لائے، تکمیل علوم کے بعد مدینہ منورہ میں درس وتدریس کا آغاز کیا جو حد درجہ مقبول ہوا، تحریک آزادی کے سلسلہ میں آپ کو مالٹا کی قید بھی برداشت کرنا پڑی اور اسی دوران آپ نے حفظ قرآن مکمل کرلیا، اس کے علاوہ آپ دار العلوم دیوبند اور جمعیۃ علمائے ہند سے بھی وابستہ رہے، اور بے مثال خدمات انجام دیں۔

دیوبند اس کی رہنمائی کے لئے لکھنؤ تشریف لائے اور ہمارے ہی مکان پر قیام فرمایا، اس سلسلہ میں مولانا کی بار بار زیارت ہوئی، اس معاملہ میں ان کا سوز دروں، جذب کامل اور ان کا استغراق دیکھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو صحابہ کرام کے ذکر اور ایک ایسے ماحول و معاشرہ میں جو مختلف اسباب کی بنا پر ان کے حقیقی مقام سے نا آشنا ہو گیا تھا، اس کو روشن و اجاگر کرنے کے لئے پیدا کیا ہے، اس کے سوا ان کی زندگی کا کوئی مقصد اور مشغلہ نہیں۔

سفر میں رفاقت کی سعادت:

مجھے مولانا کے ساتھ دو مرتبہ سفر کی سعادت بھی حاصل ہوئی، ایک مرتبہ وہ اپنے پیر بھائی اور محب حاجی مشتاق علی خاں صاحبؒ کی دعوت پر ان کے مدرسہ کے جلسہ میں شرکت کے لئے علی آباد ضلع بارہ بنکی تشریف لے جا رہے تھے، میں بھی مدعو تھا، لکھنؤ سے علی آباد تک معیت کا شرف حاصل ہوا، علی آباد میں میں نے موقع پا کر مولانا سے دریافت کیا کہ، کیا حضرت مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادیؒ[1] کے بارے میں انہوں نے کچھ سنا یا دیکھا ہے، میں اس زمانہ میں حضرت مولانا کا تذکرہ لکھ رہا تھا، مولانا نے چند جملے کہے اور پھر حضرت مولانا عبدالسلام صاحب ہنسویؒ کا ذکر شروع کر دیا، ایک مرتبہ دہلی تک معیت حاصل ہوئی، مولانا سونی پت کے کسی جلسہ میں تشریف لے جا رہے تھے، میں نے موقع غنیمت سمجھا، عرصہ سے تمنا تھی کہ مولانا

---

(۱) شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی (۱۷۹۳ء - ۱۸۹۵ء) کی ولادت اودھ کے علاقہ ''ملانواں'' میں ہوئی، ابتدائی تعلیم لکھنؤ اور اعلیٰ تعلیم شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے پاس حاصل کی، آپ شاہ محمد آفاق دہلوی صاحب سے بیعت اور منازل سلوک طے کر کے خلافت سے سرفراز ہوئے، بڑے بڑے مشائخ نے آپ کی صحبت اختیار کر کے سلوک کی تعلیم حاصل کی۔

عبدالشکور صاحب بھی نظام الدین تشریف لے چلیں اور مولانا محمد الیاس[(۱)] رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہو، اور اپنے زمانہ کی یہ دو عظیم المرتبت داعی جن کو اپنی اپنی دعوت میں پورا انہماک اور ان کی اہمیت وعظمت پر پورا یقین ہے ایک دوسرے سے ملیں، مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ مولانا سے پوری طرح واقف تھے، ان کے شیخ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری خود مولانا کا بڑا احترام کرتے تھے، اور ان کے قدر شناس تھے، امروہہ کے مناظرہ میں دونوں ایک جگہ جمع تھے، اور ایک دوسری کی مدد کر رہے تھے، میں نے مولانا سے عرض کیا کہ سونی پت جاتے ہوئے آپ تھوڑی دیر کے لئے نظام الدین بھی تشریف لے چلیں اور مولانا محمد الیاس صاحب سے ملیں، مولانا ہمارے گھر کے بچہ بچہ کا بڑا لحاظ کرتے تھے، بارہا دیکھا ہے کہ لکھنؤ کے کوئی معزز شخص بیماری کے زمانہ میں آئے اور مولانا نے ملنے سے معذرت کردی، لیکن ہمارے گھر کا یا ہنسوہ کے خاندان کا کوئی بچہ چلا گیا، تو فوراً بلا لیا، اور بڑے اعزاز کے ساتھ ملے، مولانا نے میری درخواست منظور فرمالی، اس سفر میں میرے ساتھ مولانا محمد ناظم صاحب ندوی[(۲)] اور شاہ ہادی عطا مرحوم بھی تھے، مولانا کے پاس سکنڈ کلاس (اس زمانہ کا فرسٹ کلاس) کا ٹکٹ تھا، ہم لوگوں کے پاس تھرڈ کلاس کے ٹکٹ تھے، مولانا کو جب معلوم ہوا کہ ہم تھرڈ کلاس میں بیٹھے ہوئے ہیں، تو وہ

(۱) حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ (۱۸۸۵ء-۱۹۴۴ء) ایک عظیم مبلغ اور تبلیغی جماعت کے بانی تھے، آپ کی پیدائش قصبہ کاندھلہ ضلع مظفرنگر میں ہوئی، ابتدائی تعلیم کاندھلہ اور گنگوہ میں ہوئی، اعلیٰ تعلیم کے لئے دیوبند تشریف لے گئے، تعلیم سے فراغت کے بعد درس وتدریس کا آغاز سہارنپور سے کیا، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی سے بیعت ہوئے، آپ کا سب سے اہم کارنامہ تبلیغی جماعت کا سلسلہ ہے۔

(۲) مولانا محمد ناظم ندویؒ (۱۹۱۴ء-۲۰۰۰ء) عربی زبان کے ادیب اور شاعر تھے، صوبۂ بہار کے بہار شریف میں پیدا ہوئے، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فضیلت حاصل کرنے کے بعد جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں بطور مدرس ادب عربی تقرر ہوا، کچھ عرصہ بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء واپس آگئے اور ایک عرصہ تک دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم بھی رہے۔

تشریف لے آئے اور کسی طرح راضی نہیں ہوئے کہ فرسٹ کلاس میں جائیں، ہر بار فرمایا کہ جہاں تم ہو وہاں میں، مجھے یاد ہے کہ رات بڑی بے آرامی سے گزری، سونے کا تو کیا ذکر لیٹنے کا بھی موقع بہت مشکل سے ملا لیکن مولانا خوش تھے، اور کوئی حرف شکایت زبان پر نہ آیا، دہلی پہنچے نظام الدین گئے، مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا کا بڑا اکرام فرمایا، اوران کی آمد سے بہت خوش ہوئے، دونوں نے ایک دوسرے کی پوری رعایت کے ساتھ اپنے اپنے ذوق کی بات کہی جس پر جس چیز کا غلبہ ہوتا ہے، اس کا ضرور اظہار ہو جاتا ہے کہ جام جب لبریز ہوتا ہے تو ہزار احتیاطوں کے باوجود چھلک پڑتا ہے۔

مولانا الیاس کاندھلویؒ کا اعتراف اور امام اہل سنتؒ کی تبلیغی اجتماعات میں شرکت:

پھر وہ وقت آیا کہ مولانا محمد الیاس صاحب خود لکھنؤ تشریف لائے، مجھے یاد ہے کہ دارالعلوم کی مسجد کے وضوخانہ میں وضو کرتے ہوئے، مولانا نے فرمایا کہ "مولانا عبدالشکور صاحب کا یہاں وہی درجہ ہے، جو ہمارے اطراف میں مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کا" مولانا نے "دارالمبلغین" میں مولانا محمد الیاس صاحب اور ان کے رفقاء کی دعوت کی، مولانا بڑے شوق سے تشریف لے گئے، دعا کی درخواست کی گئی تو ان الفاظ سے دعا کا آغاز کیا کہ "أوليائي تحت قبائي لا يعرفهم سوائي" جس سے اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں مولانا کا جو مقام ہے، وہ سب کو معلوم نہیں، مولانا رحیم آباد کے عظیم تبلیغی اجتماع میں بھی جو مئی ۱۹۴۶ء میں ہوا تھا، شریک ہوئے اور تقریر بھی فرمائی، یوں بھی تبلیغی جماعت اور اس کے ذمہ داروں کے ساتھ ان کا معاملہ تعاون اور اکرام کا تھا۔

رائے بریلی تشریف آوری:

ایک مرتبہ مولانا رائے بریلی تشریف لے گئے، دائرہ کی مسجد میں مدح صحابہ کا کوئی جلسہ تھا، کچھ دیر کے لئے ہمارے مسکن دائرہ شاہ علم اللہ بھی تشریف لائے، میں نے مولانا کو وہ مرقع خطوط دکھایا جس میں حضرت مولانا سید عبدالسلام صاحب ہنسوی کے کئی درجن خط تھے، بعض خطوط میں جوان کے والد ماجد کے نام تھے، ان کا ذکر خیر بھی تھا، بڑی خوشی سے مولانا نے یہ مکتوبات پڑھے اوران خطوں کو دیکھا، جہاں ان کا ذکر خیر تھا۔

دینی چیزوں کی قدردانی اوران کا احترام:

مولانا اپنے زمانہ کے مشہور مجددی شیخ حضرت پیر ابواحمد صاحب بھوپالی کے مرید ومجاز تھے، خانقاہ مجددیہ بھوپال اور اس کے صاحب سجادہ حضرت مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب (۱) سے ان کے نیازمندانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے، اور اس سلسلہ اور اس خانقاہ کی ہر چیز ان کی نظر میں عزیز و قیع تھی، مولانا شاہ محمد یعقوب صاحب بھی ان کا بڑا احترام کرتے اور بلند الفاظ میں ان کا ذکر کرتے، ایک مرتبہ فرمایا کہ "دینی چیزوں کی قدر اوران کا احترام کوئی مولانا عبدالشکور صاحب سے سیکھے" ایک سفر حج کی واپسی پر وہ

(۱) حضرت شاہ محمد یعقوب مجددیؒ (م ۱۹۷۰ء) ایک صاحب فضل وکمال بزرگ تھے، آپ کا تعلق ریاست بھوپال سے تھا، اور حضرت شاہ ابواحمد مجددی کے صاحب زادے وجانشین تھے، حفظ قرآن کا آغاز بھوپال میں کیا، ابھی ۲۷ پارے حفظ ہوئے تھے کہ حیدرآباد چلے گئے، وہاں مختلف اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، آپ کی للہیت اور تقوی اس عروج پر تھا کہ جب حضرت شاہ ابواحمد صاحب مجددیؒ نے اپنی جانشینی کے لئے متعلقین پر نظر ڈالی تو شاہ صاحب سے بہتر کوئی نظر نہ آیا، چنانچہ آپ کو اپنی زندگی میں اپنا جانشین مقرر کردیا، آپ کے ارشادات اور ملفوظات مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے "صحبتے با اہل دل" کے نام سے مرتب فرمائے ہیں، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

بھوپال اترے اور خانقاہ میں ٹھہرے، ہمارے یہاں ''مد'' کا پیانہ ہے، جو قدیم مدنی ''مد'' کے ناپ کا ہے، اور اس کی ہمارے یہاں سند بھی ہے، جو باقاعدہ سند حدیث کی طرح دی جاتی ہے، مولانا کی موجودگی میں ایک صاحب نے مجھ سے سند لی، مولانا خاموش بیٹھے سنتے رہے، کچھ فرمایا نہیں لکھنؤ جا کر کچھ دن قیام کر کے پھر بھوپال تشریف لائے، اور سند لینے کی خواہش ظاہر کی، میں نے کہا کہ آپ تو اس وقت موجود تھے، جب میں فلاں صاحب کو سند دے رہا تھا، آپ نے بھی اشارہ فرما دیا ہوتا تو اس سفر کی زحمت سے بچ جاتے، فرمایا نہیں اس وقت یہ بات ضمناً ہوتی، جو اس عظیم نعمت کے شایان شان نہیں تھی، اس کے لئے مستقل سفر کر کے آنے کی ضرورت تھی، میں اس وقت خاص اسی مقصد کے لئے آیا ہوں۔

امام اہل سنتؒ کی تواضع و بے نفسی:

حضرت شاہ صاحب مولانا کی بے نفسی کے واقعات بھی سناتے تھے، فرمایا کہ ایک مرتبہ میرے کہنے پر جمعہ کی نماز پڑھائی، سورہ والتین کے آخر میں بجائے "**فلهم أجر غير ممنون**" کے "**لهم أجر غير ممنون**" پڑھ دیا، مقتدیوں میں ایک صاحب بڑے سادہ لوح اور جلد باز تھے، پوری طرح سے سلام بھی نہیں پھیرا تھا کہ پکار کر کہا صاحبو! ٹھہر جاؤ نماز دوبارہ ہوگی، مولانا نے میری طرف دیکھا اور فرمایا دوبارہ نماز پڑھاؤں؟ میں نے کہا آپ ان کی باتوں کا کچھ خیال نہ کریں، یہ بڑے بھولے آدمی ہیں، شاہ صاحب فرماتے تھے کہ مولانا ایسے جلیل القدر عالم اور ''علم الفقہ'' کے مصنف تھے، لیکن بے نفسی اور تواضع کا یہ عالم تھا کہ یہ نہیں فرمایا کہ بھائی میں بھی کچھ پڑھا لکھا ہوں، نماز ہوگئی۔

مولانا سید عین القضاةؒ سے شرف تلمذ اور علمی مقام:

مولانا کے طبعی ذوق اور اس کام نے جو حکمت الٰہی نے ان کے سپرد کیا تھا، ان کے علم اور سلوک پر پردہ ڈال رکھا تھا، مولانا بلند پایہ اور متبحر عالم تھے، انھوں نے بڑی محنت اور تحقیق کے ساتھ معقول و منقول کی کتابیں "فخر المتاخرین" مولانا عبدالحئی فرنگی محلی (۱) کے ممتاز و معتمد شاگرد مولانا سید عین القضاۃ حیدرآبادی لکھنوی سے پڑھی تھی، ان کے علمی پایہ کا اندازہ ان کے رسائل تفسیر اور علم الفقہ سے کسی قدر ہوسکتا ہے، علم الفقہ دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو فقہ سے خصوصی مناسبت تھی، اور وہ اس پر گہری اور وسیع نظر رکھتے تھے، بعض اہل نظر اس کتاب کو بعض مشاہیر علماء کی مشہور و مقبول کتابوں کا ہم پلہ سمجھتے ہیں، اور بعض اس کو ترجیح دیتے ہیں، جہاں تک اثناعشری لٹریچر سے واقفیت کا تعلق ہے، میرے خیال میں اس عہد میں ان کی کوئی نظیر نہ تھی، میں نے ایک مرتبہ بہت ذوق شوق سے ان کو ڈاکٹر احمد امین (۲) کی کتاب "ضحیٰ الاسلام" کا وہ حصہ دیا جو مذاہب و فرق اسلامیہ پر مشتمل ہے، انھوں نے فرقہ امامیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کی اس

(۱) حضرت مولانا ابوالحسنات عبدالحی فرنگی محلیؒ (۱۸۴۸ء-۱۸۸۶ء) ایک مشہور حنفی عالم اور فقیہ تھے، پانچ برس کے ہوئے تو قرآن مجید کا حفظ شروع کیا، اور دس سال کی عمر میں حفظ مکمل کرلیا، اس دوران اپنے والد ماجد سے چند فارسی کتابیں بھی پڑھیں، گیارہ سال کی عمر میں علوم اسلامی کی تعلیم حاصل کرنی شروع کردی، اور سترہ سال کی عمر میں فارغ ہوگئے، آپ کی شخصیت ایسی جامع کمالات علمیہ و عملیہ تھی جس پر اپنے وقت کے تمام علماء متفق تھے اور آپ کی علمی استعداد اور فقہی بصیرت کا سب کو اعتراف تھا۔

(۲) ڈاکٹر احمد امین (۱۸۷۸ء-۱۹۵۴ء) مصر کے فاضل مؤلف اور عربی زبان کے عمدہ ادیب تھے، ادبی نقطۂ نظر سے آپ کی کتابیں اور تحریریں معیاری ہوتی ہیں، البتہ اس میں بعض مقامات پر ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو اسلامی نظریات سے مختلف ہیں، چنانچہ مولانا علی میاںؒ ان کی کچھ کتابوں کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: "اور اس کے مطالعہ سے ذخیرۂ حدیث پر اعتماد کسی حد تک متزلزل ہوجاتا ہے، اور اس کی بعض بنیادی شخصیتوں کے بارے میں وہ عظمت اور عقیدت قائم نہیں رہتی جو ایک مسلمان کے دل میں قائم رہنی چاہیے"۔ (میری علمی اور مطالعاتی زندگی، ص: ۲۳)۔

وقت مصر وعراق میں دھوم مچی ہوئی تھی، میں سمجھا کہ مولانا اس کو پڑھ کر مصنف کی وسعت نظر اور مطالعہ کی داد دیں گے، لیکن مولانا نے یہ کہہ کر کتاب واپس کی کہ کوئی خاص بات نہیں ہے، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ[1] کے وہ ضرور قائل تھے، اور منہاج السنہ کی تعریف کرتے تھے کہ "مطاعن صحابہ کی تردید میں یہ کتاب خاص طور پر ممتاز ہے، اس بارے میں ان کی نظیر ملنی مشکل ہے"

امام اہل سنت کی حقیقت پسندی:

تصوف کا اثر کہئے یا مولانا کی سلامت طبع اور حقیقت پسندی کہ فرقہ اثنا عشریہ سے طویل مناظرہ کے باوجود حضرت علی مرتضیٰ اور امیر معاویہؓ کے بارے میں انھوں نے ہمیشہ فرق مراتب کا لحاظ رکھا، وہ بڑے جوش کے ساتھ حضرت علیؓ کی فضیلت ومنقبت بیان کرتے تھے، ان کا نام لیتے وقت معلوم ہوتا تھا کہ ان کا دل ان کی عقیدت وعظمت سے معمور بلکہ مخمور ہے، اہل بیت کرام کے بھی پورے مرتبہ شناس اور ان کی محبت میں سرشار تھے، مولانا نے حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی معرکۃ الآراء کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" اور حضرت شاہ ولی اللہ صاحب[2] کی بے نظیر کتاب "ازالۃ الخفاء" کا اردو میں ترجمہ بھی کیا، میں نے کئی

(۱) شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ (۶۶۱ھ-۷۲۸ھ) نابغہ روزگار علماء میں سے تھے، آپ مجددانہ شان کے حامل ایک عظیم علمی شخصیت کے مالک تھے، رد فرق باطلہ پر اور خاص طور پر شیعیت کے خلاف آپ کی کاوشیں نمایاں ہیں، آپ کے چھوڑے ہوئے سرمایہ سے آج بھی لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں، آپ نے بیس سال کی عمر میں درس حدیث کا آغاز کیا اور ایسا شاندار درس دیا کہ سامعین دنگ رہ گئے، اور روز بروز آپ کے درس کو مقبولیت حاصل ہونا شروع ہوگئی، بعض مسائل میں آپ نے اپنے مسلک (حنبلی) سے مختلف رائے بھی قائم کی۔

(۲) شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ (۱۷۰۳ء-۱۷۶۲ء) کی پیدائش حضرت مجدد الف ثانیؒ کی وفات کے تقریباً اسی سال بعد ہوئی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ سے زبردست دینی اور تجدیدی خدمات لیں، اور مسلمانوں کی رہنمائی کے سلسلہ میں آپ نے جو کوششیں کیں وہ بہت مقبول ہوئیں، آپ نے مسلمانوں کے اندر دینی حمیت اور بیداری پیدا کی، اسی لئے آج برصغیر کے تمام ادارے آپ کو اپنا فکری امام تسلیم کرتے ہیں۔

معتبر آدمی سے سنا ہے کہ مرزا حیرت دہلوی (۱۹۲۸ء) کے نام سے جو ترجمہ قرآن مشہور ہے وہ اصلاً مولانا ہی کا لکھا ہوا ہے۔

ندوۃ العلماء سے تعلق:

مولانا فراغت کے بعد کچھ عرصہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں جو اس وقت نیا نیا قائم ہوا تھا، مدرس بھی رہے، اور نہایت قلیل تنخواہ پر یہ خدمت انجام دی، آخری حیات میں وہ مسلسل ندوۃ العلماء کے رکن انتظامی منتخب ہوتے رہے، ناظم ندوۃ العلماء مولانا سید ڈاکٹر عبدالعلی صاحب سے بالکل عزیزانہ اور خاندانی قسم کے تعلقات تھے، ڈاکٹر صاحب کی نماز جنازہ بھی انہی نے پڑھائی۔

سانحہ وفات:

آخر میں ۱۷؍ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ مطابق (۲۳؍اپریل ۱۹۶۲ء کو پانچ مہینے کی علالت کے بعد اپنے خالق سے جا ملے، اور امید ہے کہ اپنی دینی خدمات کی بدولت اور مقام رسالت، مقام قرآن اور مقام صحابہ کو روشن اور اجاگر کرنے کے صلہ میں مقام قرب و رضا سے نوازے گئے ہوں گے، امین آباد پارک میں ایک مجمع کثیر نے ان کی نماز جنازہ پڑھی، ان کے بڑے فرزند مولانا عبدالسلام صاحب فاروقی [1] نے امامت کی لکھنؤ میں کسی کے

(۱) حضرت مولانا حافظ محمد عبدالسلام فاروقی (۱۹۰۷ء-۱۹۷۳ء) کی پیدائش آپ کے آبائی وطن کاکوری میں ہوئی، ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی سے حاصل کی، پھر مختلف شخصیات کی خدمت میں حاضر ہو کر علوم اسلامی کی تکمیل فرمائی، مولانا ایک زبردست مقرر، متکلم، اور مناظر تھے، آپ کی شخصیت علمی حلقوں میں معروف تھی، تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے والد ماجد کے تعاون کے لئے دارالمبلغین میں بحیثیت مدرس مقرر ہوئے اور نہایت دلجمعی سے خدمات انجام دیں، پھر آپ ہی اس ادارہ کے مہتمم بنے اور آپ کے زمانہ میں ادارہ میں نئے شعبوں کا اضافہ ہوا، اور طلباء کی تعداد بھی بڑھی۔

جنازہ میں اتنا ازدحام کم دیکھا گیا ہوگا۔[1]

امام اہل سنتؒ کی وفات عالم اسلام کا اہم ملی ودینی حادثہ:

''نہ صرف ہمارے شہر لکھنؤ اور نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمِ اسلام اور عصر حاضر کا ایک اہم ملی اور دینی حادثہ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی کی وفات ہے۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا اس وقت دنیائے اسلام کے ممتاز ترین علماء ومصلحین اور ان چند برگزیدہ شخصیتوں میں سے تھے جن سے اللہ تعالی نے تاریخ اسلام کے مختلف زمانوں میں خاص اصلاحی اور تجدیدی کام لیا ہے، وہ علاوہ اس کے کہ ایک بڑے متبحر عالم اور عمیق النظر فقیہ تھے، ایک کامیاب مصنف اور متکلم، صاحب سلوک اور صاحب سلسلہ شیخ اور خوش بیان مقرر بھی تھے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت اور امتیاز یہ تھا کہ انھوں نے عامۃ مسلمین اور اہلسنت کے ذہنوں کو صاف کرنے کا اور صحابۂ کرام سے ان کا رابطہ تازہ اور مستحکم کرنے کا ضروری کام انجام دیا اور اس سلسلہ میں ان غلط فہمیوں اور غیر اسلامی اثرات سے بچایا جو ناواقفیت، غلط صحبت، اور غلط پروپیگنڈے سے ان میں سرایت کر گئی تھیں۔ حقیقت میں ہندوستان کی سرزمین میں اس مخصوص سلسلہ کے جس اصلاحی کام کو حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت شاہ ولی اللہ اور شاہ عبد العزیز صاحب نے اپنے اپنے وقتوں میں انجام دیا تھا مولانا نے اس کو بہت آگے بڑھایا اور اس کی ترقی وتکمیل کی خدمت انجام دی۔ اس میں مبالغہ نہیں ہے کہ وہ اس موضوع خاص اور شیعہ لٹریچر اور ان کے عقائد اور علم کلام کے اس زمانے میں سب سے بڑے عالم اور ناقد تھے اور اس سلسلہ میں نہ صرف یہ کہ عصر حاضر میں ان کی کوئی نظیر نہ تھی بلکہ یہ بھی واقعہ ہے کہ ان کی

---

[1] بحوالہ: پرانے چراغ، حصہ دوم، ص:۱۹۱-۱۹۸۔

تحقیقات بہت سے قریب العصر متقدمین سے بھی آگے بڑھ گئی تھیں، نہ صرف صحابۂ کرام سے مسلمانوں کا رابطہ پیدا کرنے میں بلکہ قرآن مجید اور دینی عبادات کے ساتھ بھی تعلق پیدا کرنے اور نمازوں کی پابندی اور اس کی تبلیغ واشاعت میں بھی خصوصیت کے ساتھ اودھ اور لکھنؤ کے قرب وجوار میں مولانا کا بہت بڑا حصہ ہے۔

امام اہل سنتؒ کی زندگی علمائے سلف کی زندگی کا نمونہ تھی:

ان تمام علمی کمالات اور اصلاحی خدمات کے ساتھ مولانا کی زندگی بڑی سادہ اور زاہدانہ اور علمائے سلف کی زندگی کا نمونہ تھی۔ انھوں نے آخر وقت تک زہد وقناعت اور تورع کی زندگی گذاری اور اپنی مقبولیت اور شہرت سے کوئی مادّی منفعت حاصل نہیں کی۔ جو لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے وہ اس سادہ اور درویشانہ زندگی سے بہت متاثر ہوتے۔ باوجود اس کے کہ ان کے مریدین اور محبین کا حلقہ بہت وسیع تھا اور وہ ہندوستان اور بیرون ہند میں بڑی شہرت اور مقبولیت رکھتے تھے مگر ان کی قیام گاہ پر کسی تجمل وامارت کا ادنی سا نشان بھی نہیں ملتا تھا۔ مزاج میں نہایت درجہ کی تواضع اور سادگی تھی۔ تقریر وتحریر جچی تلی، حشو وزوائد سے پاک اور تصنع کے ادنی شائبہ سے بھی بالکل دور تھی۔ اس کے باوجود ان کے مواعظ نہایت مؤثر ودل نشیں اور تحریر نہایت شیریں اور شگفتہ تھی ان کی تصنیفات میں علم الفقہ، سیرۃ النبوی کا رسالہ، سیرت خلفائے راشدین، بعض آیات کی تفاسیر اور بعض اہم تراجم شامل ہیں۔ عرصۂ دراز تک علمی ودینی دنیا میں وہ خلا محسوس کیا جائے گا جو مولانا کی وفات سے پیدا ہوگیا ہے اب موجودہ علمی اور دینی انحطاط کے پیش نظر اس کا پُر ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے"(۱)۔

---

(۱) بحوالہ: امام اہل سنت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ حیات وخدمات، ص: ۷۱۴-۷۱۵۔

علماء ومشائخ عصر میں انفرادیت وتجدیدکارنامہ:

مشائخ عصر کی خدمت میں اپنے مرشد ومربی حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری اور اپنے اولین شیخ حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری [1] کے ماسوا (جن کی خدمت میں حاضری، تقسیم ملک کے بعد مشکل ہوگئی تھی)، تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد مسترشدانہ اور خادمانہ حاضری ہوتی رہتی سب سے زیادہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب (۱۸۹۸ء-۱۹۸۲ء) سے ربط وتعلق تھا، رائے پور آتے جاتے ان کی خدمت میں قیام ضروری تھا، شیخ کی جامعیت بے پایاں شفقت اور علمی مناسبت (جس میں ایک خورد وخوشہ چین تھا دوسرا بزرگ محقق ومحدث عصر) نے اس ربط وتعلق میں اور اضافہ کردیا تھا، اسی شفقت واعتماد کا نتیجہ تھا کہ حضرت شیخ نے اپنی تمام عربی تصنیفات اور جن کتابوں کی انھوں نے تحقیق وتکمیل فرمائی تھی، ان پر مجھ سے باصرار مقدمہ لکھوایا، ان کی شفقتوں دل جوئیوں اور کرم فرمائیوں کی تفصیل ان کی سوانح میں دیکھی جاسکتی ہے، جو ابھی حال میں راقم ہی کے قلم سے نکل کر شائع ہوئی ہے۔ یہاں پر ایک گرامی نامہ کا مختصر اقتباس نقل کیا جاتا ہے، جس کو شیخ کی سوانح میں درج کرنے میں تو حجاب محسوس ہوا لیکن اپنی سوانح میں تحدیث بالنعمۃ کے طور پر درج کرنے میں حرج نہیں:

> ''دعاؤں میں نہ مکہ میں دریغ ہوا، نہ مدینہ پاک میں، اور یہ بھی یاد نہیں کہ کسی دن آپ کے لئے صلوٰۃ وسلام میں تخلّف ہوا ہو، اس سے تو آپ کو بھی انکار

---

(۱) حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ (۱۸۸۷ء-۱۹۶۲ء) ایک عظیم مفسر قرآن اور زبردست عالم تھے، اور ان کا تعلق سلسلۂ قادریہ راشدیہ سے تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کو ان سے اجازت وخلافت حاصل تھی اور تفسیر وحجۃ اللہ البالغہ میں شرف تلمذ حاصل تھا۔

نہیں ہوگا کہ دل بستگی جتنی آپ سے ہے، اتنی کسی سے بھی نہیں رہی"۔ (۱)

شیخ الحدیث کے ماسوا، مشائخ عصر میں سے سب سے زیادہ ذہنی مناسبت بھوپال کے حکیم وعارف شیخ حضرت شاہ محمد یعقوب مجددیؒ سے تھی (۲)، بھوپال کے سالانہ تبلیغی اجتماع کے سلسلہ سے (جو ۲۵؍۳۰ سال سے قائم ہے) راقم سطور قریب قریب ہر سال بھوپال حاضر ہوتا تھا، خاندان اور سلسلہ کے روابط، مزید برآں رفیق قدیم مولانا حافظ محمد عمران خاں صاحب (۳) کے حضرت سے خصوصی ربط وتعلق کی بنا پر حضرت کے یہاں حاضری دینی شروع کی، حضرت کی بہت جلد توجہ خاص ہوگئی، اجتماع کے موقع پر خاص طور پر مجھ پر دریافت فرماتے اور میری آمد کا انتظار فرماتے، ایک مرتبہ ازراہ شفقت مجھے نہ پاکر اور مجمع کو دیکھ کر ایک مکتوب (۴) میں یہ شعر تحریر فرمایا۔

ہمہ شہر پُرز خوباں، منم و خیال ما ہے
چہ کنم کہ چشم بد خُو نکند بہ کس نگا ہے

دل را بہ دل رہیست، مجھے بھی حضرت کے ارشادات وملفوظات میں تصوف واحسان کے لطیف نکتوں، نادر تحقیقات کے ماسوا بھی زندگی کے عمیق مطالعہ، مسلمانوں کے

---

(۱) مکتوب از مدینہ منورہ، ۲۲؍رجمادی الاولی ۱۳۹۳ھ۔

(۲) حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی شاہ ابواحمد مجددی کے صاحبزادے وجانشین تھے اور امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقیؒ کو شاہ ابواحمد مجددی سے اجازت وخلافت حاصل تھی۔

(۳) حضرت مولانا عمران خان ندویؒ (۱۹۱۳ء-۱۹۸۶ء) ہندوستان کے معروف عالم دین تاج المساجد کے بانی وناظم اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم تھے، دینی علوم کی تکمیل ندوہ سے کی اور وہیں مدرس مقرر ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد مہتمم بنادیے گئے۔

(۴) مکتوب مورخہ: ۱۰؍ذی قعدہ ۱۳۸۹ھ۔

مختلف طبقوں سے گہری واقفیت اور ان کی کمزوریوں اور مغالطوں کی نشان دہی، اصلاح باطن کی ضرورت کو اس زمانہ کے طبائع واذواق کے مطابق بیان کرنے اور اس کو ایک بدیہی حقیقت اور ضرورت ثابت کرنے، شکستہ دلوں کی تسکین اور مثالوں اور چھوٹی چھوٹی حکایتوں کے پیرایہ میں عمیق ودقیق حقائق کو بیان کردینے کا ایسا خداداد ملکہ اور کمال اور اس کے ایسے دل آویز نمونے نظر آئے جن کی مثال کم سے کم اس دور مادیت اور رسمیت میں نہیں دیکھی۔(۱) **وفوق كل ذي علم عليم.**

حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب کے بعد سب سے زیادہ ربط اور عقیدت مولانا وصی اللہ صاحب فتح پوری سے رہی، جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے خلفائے کبار میں تھے، اور تقسیم کے بعد کم سے کم ہندوستان میں ان کے خلیفۂ اجل اور ان کے طریقۂ تربیت کے حامل وامین تھے، ۱۹۵۴ء میں ان کی خدمت میں خود ان کے وطن فتح پور تال نرجا حاضری ہوئی، اور پہلی حاضری میں ہی انہوں نے ایسی خصوصی شفقت فرمائی کہ مجھے بھی حیرت اور شرمندگی ہوئی، مولانا کے فتح پور منتقل ہوجانے کے بعد گورکھپور، پھر الہ آباد جہاں مستقل قیام فرمالیا تھا، وقفوں کے بعد حاضری ہوتی رہی، بمبئی کے قیام میں بھی جہاں سے آخر میں مولانا کا خاص ربط پیدا ہوگیا تھا، حاضری دیتا رہا، الہ آباد جاتا تو مولانا ہی کا مہمان ہوتا، اور مولانا کی شفقتوں کے عجیب انداز اور ادائیں دیکھتا، خط وکتابت بھی رہی، ایک مکتوب میں تحریر فرمایا۔ ''جو حضرات اہل علم میرے پاس آمد ورفت فرماتے ہیں، ان میں

(۱) مفکر اسلامؒ نے ۱۹۶۷ء سے حضرت کے ملفوظات قلم بند کرنا شروع کیے، اب اس مجموعہ ملفوظات ''صحبتے با اہل دل'' کے کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔

غالباً سب سے زیادہ قلب کا رجحان جناب کی طرف ہوتا ہے"۔[1] نومبر ۱۹۶۷ء کو آخری سفر حجاز کے موقع پر جو سفر آخرت ثابت ہوا، آخری ملاقات ہوئی، اپنے گدے پر بٹھایا، اور بڑی راز داری کے ساتھ لب مبارک کو کان کے پاس لاکر فرمایا کہ دعا کرو کہ حاضری ہوجائے، جہاز ہی پر بیت کے بجائے رب البیت کے پاس پہنچ جانے کا جو اچانک واقعہ پیش آیا، اس نے اس جملہ کی حکمت واضح کردی۔

مولانا وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ تھانوی سلسلہ کے ایک دوسرے بزرگ حاجی عبدالغفور صاحب جودھپوری سے عقیدت ومناسبت رہی، ایک مرتبہ جودھپور رفیق محترم مولانا محمد منظور صاحب[2] کے ساتھ جاکر دو ایک دن ان کی خدمت میں "اشرف منزل" میں قیام کیا، ان کی سادگی، بے نفسی، شفقت اور ماحول وخاندان میں ان کی تربیت وصحبت کے برکات دیکھے، تھانوی سلسلہ اور اس کے مزاج ومذاق کی متعدد بہترین خصوصیات کو انھوں نے اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔

ان حضرات کے بعد اب مولانا محمد احمد صاحب پھول پوری، یادگار سلف اور مشائخ کبار کا نمونہ رہ گئے ہیں، جب کبھی توفیق ہوتی ہے انھیں کی خدمت میں حاضر ہوکر ذکر الٰہی،

(۱) مکتوب شوال ۱۳۷۷ھ۔

(۲) حضرت مولانا منظور نعمانی صاحبؒ (۱۹۰۵ء - ۱۹۹۷ء) ہندوستان کے معروف عالم دین اور نامور مصنف تھے، ابتدائی تعلیم آبائی وطن سنبھل میں ہوئی، اور علوم اسلامی کی تکمیل دارالعلوم دیوبند سے کی، تدریس کا آغاز امروہہ سے کیا، ایک عرصہ تک دارالمبلغین لکھنؤ سے بھی وابستہ رہے، پھر مولانا سید ابوالحسن علیؒ کے اصرار پر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریسی خدمات انجام دیں، اسی کے ساتھ ایک معیاری رسالہ "الفرقان" کے نام سے نکالا جو آج بھی جاری ہے، آپ کچھ عرصہ مولانا مودودی کے ساتھ بھی رہے، لیکن جب ان کے نظریات کا علم ہوا تو الگ ہوگئے۔

فکر آخرت اور تواضع و اخلاص کے وہ نمونے اور مناظر دیکھ لیتا ہوں جو اب صرف کتابوں کے اندر ملتے ہیں۔ اطال اللہ بقاءہ

جہاں تک اپنے شہر لکھنؤ کا تعلق ہے، یہاں دو بزرگ ہستیاں تھیں، جن کی خدمت میں نیاز حاصل تھا، ایک مولانا شاہ وارث حسین صاحب جن کا قیام شاہ پیر محمد صاحب کے ٹیلہ پر رہتا تھا، وہ ہمارے شہر لکھنؤ کے کثیر التعداد وکلاء، اعلیٰ عہدیداروں اور صاحب وجاہت لوگوں کے پیرو مرشد تھے، اور ان کے ذریعہ اس طبقہ میں بڑی اصلاح ہوئی اور دینداری پیدا ہوئی، ان کو بیعت حضرت گنگوہیؒ (۱) سے تھی اور اجازت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ صاحب (۲) سے، وہ میرے والد صاحب اور بھائی صاحب سے اچھی طرح متعارف تھے، میں بہت زیادہ تو ان کی خدمت میں حاضر نہیں ہو سکا وہ میری طالب علمی و مدرسی کا دور تھا، لیکن جب بھی حاضر ہوا، خاندانی بزرگوں کی طرح شفقت فرمائی اور یہ معلوم کر کے میں قرآن شریف کا درس دیتا ہوں، مزید عنایت اور حوصلہ افزائی فرمائی اور برکت کی دعا دی۔

دوسری قابل احترام اور شہرۂ آفاق شخصیت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقیؒ کی تھی،

(۱) حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (۱۸۲۹ء - ۱۹۰۵ء / ۱۳۲۳ھ) گنگوہ ضلع سہارنپور میں پیدا ہوئے، تعلیم کے حصول کے لئے مختلف اساتذہ کی صحبت اختیار کی، سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے سرفہرست خلفاء میں تھے، آپ دارالعلوم دیوبند کے سرپرست بھی رہے، ایک مرتبہ جیل جانے کا اتفاق ہوا تو جیل میں موجود قیدی آپ کے معتقد ہو گئے اور نماز باجماعت ادا کرنے لگے۔

(۲) شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ (۱۸۵۱ء - ۱۹۲۰ء) ہندوستانی مسلمانوں کے عظیم قائد اور زبردست رہنما تھے، آپ نے دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی، فراغت سے پہلے ہی آپ کا تقرر معین مدرس کے طور پر ہو گیا، آپ نے دیوبند میں چالیس سال تک درس حدیث دیا، مالٹا کی قید کے دوران بھی آپ نے جیل میں درس کا سلسلہ قائم رکھا، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے اجازت بیعت و خلافت حاصل رہی تحریک آزادی کے عظیم مجاہد و رہنما اور تحریک ریشمی رومال کے بانی بھی تھے۔

جن سے قدیم روحانی اور خاندانی تعلقات تھے، اس لئے کہ ان کے والد ماجد مولانا مولوی ناظر علی صاحب میرے والد کی ماموں حضرت مولانا سید عبدالسلام صاحب ہنسوی مجددی (خلیفۂ خاص حضرت شاہ احمد سعید صاحب دہلوی مجددی) کے مرید باختصاص اور مجاز تھے، مولانا عبدالشکور صاحب کو اس سلسلہ کے بزرگوں سے عام طور پر اور حضرت مولانا عبدالسلام صاحب سے عقیدت ہی نہیں عشق سا تھا، وہ اس تعلق کی بناء پر ہمارے خاندان کے ہر فرد بلکہ بچہ بچہ کا احترام کرتے تھے، مجھ پر بھی خصوصی شفقت فرماتے۔ میری ہی درخواست پر ایک مرتبہ میرے ساتھ حضرت مولانا محمد الیاسؒ صاحب کے پاس نظام الدین دہلی تشریف لے گئے، اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرامؓ کی سینوں کے دل میں عظمت پیدا کرنے، ان کے حقوق ومقام سے آشنا کرنے اور شیعیت کے ان اثرات کو دور کرنے کے سلسلے میں (جو سلطنت اودھ کے اثرات سے اودھ میں گھر گھر پھیلے ہوئے تھے) ان سے تجدیدی خدمت لی۔ مجھے خاص طور پر ان کی جس ادا نے فریفتہ کیا اور ان کا معتقد بنایا، وہ اولاً ان کی سادگی، تواضع اور بے نفسی تھی، دوسرے ان کا حقانی وربانی وعظ جو علمائے سلف کی طرح ہر طرح کی لفاظی اور تصنع سے پاک، عقائد کی اصلاح، فرائض کی پابندی اور تذکیر بالآخرۃ پر مشتمل ہوتا تھا۔ (۱)

(۱) بحوالہ: کاروان زندگی، جلد اول، ص: ۲۴۳-۲۴۷، مطبوعہ مکتبۂ اسلام لکھنؤ۔

امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنویؒ

کے قائم کردہ

''شہدائے اسلام''

کے ۱۵؍روزہ تبلیغی واصلاحی جلسوں میں

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ

کے خطابات



مناقب ومدح صحابہؓ کے جلسوں کا پیغام اور اس کے تقاضے اور شریک ہونے والوں کی ذمہ داریاں [1]

الحمد الله نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ بالله من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده الله فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له ونشهد أن لا إله إلا الله وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا ومولانا محمدا عبده ورسوله صلى الله عليه وآله وصحبه وذريته وأزواجه وأهل بيته وبارك وسلم تسليما كثيرا كثيرا. أما بعد!

امام اہل سنت علیہ الرحمہ کے ذریعہ سے آپ کو جو مواقع میسر آئے ملکوں میں اس کی مثال نہیں ملتی ہے:

حضرات!

اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام، آغوش نبوت کے پروردہ، اور دبستان نبوت کے تعلیم وتربیت

(۱) یہ تقریر ۱۱ محرم الحرام ۱۴۱۱ھ کو مولانا عبدالشکور ہال احاطہ شوکت علی میں جلسہ شہدائے اسلام میں فرمائی تھی، یہ ایک رسالہ کی شکل میں پہلے بھی شائع ہو چکی ہے، مفکر اسلام علیہ الرحمہ اس کے متعلق فرماتے ہیں: ''اس میں بہت سی کام کی باتیں اور قابل توجہ واصلاح امور جن کا مسلمانوں کی عام زندگی، اخلاق ومعاشرہ سے بھی تعلق ہے آگئے ہیں، اس کو رسالہ کی شکل میں پیش کرنا انشاء اللہ مفید اور بہت سے لوگوں کے لئے چشم کشا اور (اگر اس کو سنجیدگی اور عمل کرنے کے ذہن سے پڑھا گیا تو) ذریعۂ اصلاح ونفع ہوگا''۔

یافتہ، حضرات کے حالات وخصوصیات معلوم کرنے کے لئے حضرت امام اہل سنت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات سے، اور پھر ان کی دعوت سے، ان کے ادارہ (۱) سے اور سلسلۂ ہدایت ومواعظ (۲) کے ذریعہ سے آپ کے لئے جو مواقع فراہم فرمائے، بہت کم شہروں میں بلکہ کہنا چاہئے بہت سے ملکوں میں دور دور اس کی مثال نہیں ملتی، آپ کو اس کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے یہ مواقع میسر فرمائے آسان کئے، فراہم کئے اور قابل استفادہ بنائے، میں بھی اپنی سعادت سمجھ کر "خون لگا کر شہیدوں میں" شریک ہونا جس کو کہتے ہیں، اس ذہن کے ساتھ حاضر ہوا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ شاید یہ میرے لئے بھی مغفرت کا اور قبولیت کا ذریعہ بنے، میں آپ سے بنیادی باتیں کہنا چاہتا ہوں۔

ہر چیز کا شکریہ اس کے شایان شان ہوتا ہے:

حضرات! آج گیارہواں دن ہے کہ آپ برابر خلفائے راشدین اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے بارے میں سن رہے ہیں، آپ کی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے اور ہندوستان کے بہت منتخب اور ممتاز علمائے کرام، مقررین عظام تشریف لائے اور آپ نے ان کے مواعظ سنے، آپ یہاں سے کیا نتیجہ لے کر جائیں گے، اس کا آپ پہ کیا اثر ہوگا آپ ان مواعظ کا شکریہ کس طرح سے ادا کریں گے؟ یاد رکھئے نعمت کا شکر اس نعمت کی جنس سے ہوتا ہے اور اسی نعمت کے مطابق ہوتا ہے، کھانے کا شکریہ کھانے کے مطابق ہوتا ہے، مہمان نوازی اور خاطر داری کا شکریہ اس کے مطابق ہوتا ہے اور قصیدہ

(۱) دارالمبلغین لکھنؤ۔
(۲) تحریک مدح صحابہؓ اور جلسہ شہدائے اسلام۔

خوانی کا شکریہ اس کے مطابق ہوتا ہے، اسی طریقہ سے جب تفریحی چیزوں کا سامان مہیا کیا جائے تو ان کا شکریہ ان کے مطابق ہوتا ہے وہ ان کی جنس سے تعلق رکھتا ہے، آپ حضرات خلفائے راشدینؓ کے بارے میں صحابہ کرامؓ کے بارے میں سن کر جاتے ہیں، جواہرات اور موتی بکھیرے جاتے ہیں اور وہ آپ کے جیب و دامن میں آتے ہیں، ان کا شکریہ کیا ہے؟ اللہ تبارک وتعالیٰ کی نعمتوں کا شکریہ اللہ کی نعمتوں کے شایان شان، اللہ کے پیغمبروں کے احسانات کا شکریہ، اللہ کے پیغمبروں کے احسانات کے شایان شان مصلحین اور داعیان دین اور مشائخ کرام اور مرشدین اور دین کے محسنین کا شکریہ ان کے شایان شان ہوتا ہے، تو اسی طریقہ سے ہر دعوت کا، ہر تحریک کا، ہر محفل کا شکریہ اور اس کا اثر ان کے مطابق ہونا چاہئے، اور آپ کے اندر صلاحیت پیدا ہونی چاہئے، اگر آپ علمی مذاکروں میں جاتے ہیں جن کا آج کل بڑا رواج ہے، جگہ جگہ علمی سیمینار ہو رہے ہیں، کونشن ہو رہے ہیں، تو اس موضوع کے مطابق آپ استفادہ کرتے ہیں، اسی موضوع کے تقاضہ سے آپ وہاں سے نتیجہ لے کر جاتے ہیں، اثر لے کر جاتے ہیں اور اسی سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اسی طرح آپ سیاسی جلسوں میں شریک ہوتے ہیں تو سیاسی شعور اور سیاسی بیداری پیدا ہونی چاہئے، جس پارٹی کا جلسہ ہے اس پارٹی کے متعلق ذہن بننا چاہئے یا بدلنا چاہئے، تو اگر خلفائے راشدین کے مناقب وفضائل کی مجلس ہو، بار بار ہو اور آپ بار بار شریک ہوں تو اس کا شکریہ کس طرح ادا ہو سکتا ہے، اور اسکے شایان شان کیا ہے، اور اس سے آپ کی زندگی میں کیا اثر پڑنا چاہئے، کیا تبدیلی اور اصلاح آنی چاہئے۔

میں ان چیزوں کی طرف اشارہ کروں گا جو ان مجالس کے مزاج کے مطابق ہیں اور

ان کا طبعی تقاضہ ہے، عقلی تقاضہ ہے، منطقی تقاضہ ہے، شرعی تقاضہ ہے، اخلاقی تقاضہ ہے، انسانی تقاضہ ہے، اور سب سے بڑھ کر دینی تقاضہ ہے۔

ادارہ کی تعریف اس کے فضلاء کی وجہ سے ہوتی ہے:

اس سلسلہ کی ایک بات تو یہ ہے کہ آپ کے ذہن میں حضرت خلفائے راشدین کی عقیدت پیدا ہو، ان کے بارے میں آپ کے اندر اعتماد ہو، آپ کے ذہن میں یہ خیال راسخ ہو جائے کہ وہ نسل انسانی کے (انبیاء کرام کے بعد) بہترین افراد اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل واحسان، اس کی خلاقی، رزاقی اور تربیت کا بہترین نمونہ ہیں۔

پہلی بات یہ ہونی چاہئے کہ آپ اس محفل سے یہ اثر اور نتیجہ لے کر جائیں، اگر ہم کسی حکیم کی تعریف کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعہ بہت سے مریضوں نے شفا پائی، وہ حکیم ہی کیا ہے، طبیب ہی کیا ہے جس کے ہاتھ ایک کی بھی شفا نہ ہوئی ہو، یا مشکل سے دو چار آدمیوں کو فائدہ پہنچا ہو، اگر ہم کسی عالم ومدرس کی تعریف کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حلقۂ درس سے بہت سے فضلاء تیار ہوئے اور وہ علم وفضل میں امتیازی درجہ رکھتے تھے، ورنہ پھر مدرس کا فائدہ ہی کیا، اور اس مدرس کی کامیابی کا معیار کیا؟ اگر ہم کسی کارخانہ کی تعریف کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بہترین مصنوعات پیدا کرتا ہے، ایک مرتبہ ہم نے یہیں کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ اگر ہم سے کوئی کہے (لکھنؤ کے بھائیوں کو سنا رہا تھا) کہ ہاں صاحب! احمد حسین ولدار حسین کا کارخانہ (۱) بہت اچھا ہے، مگر شروع میں تمباکو کے کچھ اچھے ڈبے وہاں سے بنے تھے پھر جو دیکھا تو ہر

(۱) لکھنؤ میں تمباکو کا مشہور ومعروف کارخانہ تھا۔

ڈبہ خراب تھا، تو یہ ایسی بات ہوگی کہ اس کارخانہ والے کو آپ کے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کرنے کا حق ہوگا کہ آپ نے اس کارخانہ کو بدنام کیا، وہاں کی شہرت کو خراب کیا، میں مدرسہ کے ایک خادم کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ہندوستان ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کی ایک نامور اور مسلم درسگاہ ندوۃ العلماء کا خادم ہوں، اگر ندوۃ العلماء کے متعلق کوئی یہ کہے ہاں صاحب! شروع میں اس کے دارالعلوم نے چند اچھے فاضل پیدا کئے۔ علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، اس کے بعد پھر کوئی نہیں نکلا اور کسی میں کوئی استعداد پیدا نہیں ہوئی، تو سب سے پہلے میں اس کا دامن پکڑنے کو تیار ہوں، ندوۃ العلماء کے ذمہ دار، ندوۃ العلماء کے کارکن اور اس سے نسبت رکھنے والے دامن پکڑنے کو تیار ہیں، آپ سے کہا جائے گا کہ پہلے آپ اس کا ثبوت دیجئے کہ آپ اس ادارہ کی تاریخ سے کہاں تک واقف ہیں، اس کے فضلاء سے آپ کہاں تک آشنا ہیں، ان کے کارناموں سے آپ کہاں تک واقف ہیں، اسی طریقہ سے میں نے مختلف مدرسوں مختلف کارخانوں کا نام لیا، اصغر علی محمد علی ہندوستان میں عطر سازی کا شہرۂ آفاق کارخانہ تھا، دور دور اس کی شہرت تھی، اگر کہا جاتا، ہاں صاحب! شروع میں دو چار مہینے ان کے یہاں اچھی عطر کی شیشیاں تیار ہوئی تھیں، اسکے بعد یہ بھی معلوم نہیں دیتا تھا کہ شیشی میں عطر ہے، پانی ہے، یا تیل ہے؟ تو کارخانہ کے مالکان کو حق ہے کہ اس کے خلاف کارروائی کریں۔

صحابہ کرام کے ایمان میں شک کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین ہے:

میں کہتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے سب سے بڑے پیغمبر سید المرسلین خاتم النبیین سید الاولین والآخرین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معاذ اللہ یہ کہا جائے کہ

براہ راست جن لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن تربیت سے وابستہ تھے، جو آغوش نبوت میں پلے تھے، جنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سایہ عاطفت میں زندگی گزاری اور جن پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے معجزانہ اثرات پڑے تھے، جن کو دنیا میں نمونہ بننا تھا، ان میں دو ایک، یا تین چار آدمی بس دین پر قائم رہے، عہد پر قائم رہے، بقیہ سب دین سے نکل گئے تو اس سے بڑھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں کوئی توہین آمیز بات اور اس سے بڑھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام نبوت اور آپ کی شانِ رسالت کی بلکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے ان انعامات کی جو آپ کے ساتھ مخصوص تھے ناقدری نہیں ہوسکتی۔

صحابہ کرامؓ پوری نوع انسانی میں ہر لحاظ سے سب سے بہتر و برتر ہیں:

ایک بات تو یہ ہے کہ یہ عقیدت اور اعتماد آپ اپنے اندر لے کر جائیں کہ صحابہ کرامؓ نسل انسانی میں اور یہ میں تاریخ کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں، اور کسی چیز کا دعوی کروں یا نہ کروں یہ کوئی ایسا دعویٰ نہیں ہے کہ جس میں معذرت کے ضرورت ہو کہ میں تاریخ کی کتابوں کا کیڑا ہوں، تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں اور تاریخی موضوعات پر لکھنے والوں کی اس عہد میں اگر اس کی کوئی فہرست بنائی جائے تو اس فہرست کے آخر میں میرا نام آنا چاہئے، میں تاریخی بصیرت، تاریخی مطالعہ کی روشنی میں بہ بانگِ دہل کہتا ہوں کہ خلق آدم سے لے کر تا قیام قیامت انبیائے کرام علیہم السلام کے گروہ کو چھوڑ کر کمالات انسانی کے لحاظ سے، ہدایت ربانی کے لحاظ سے، فیض انسانی کے لحاظ سے، مکارم اخلاق کے لحاظ سے، تقدس کے لحاظ سے، پاکیزگی کے لحاظ سے، بے غرضی کے لحاظ سے، اخلاص کے لحاظ

ہے، اور رحمت و برکت کے لحاظ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر پوری نوع انسانی میں کوئی پیدا نہیں ہوا، اور یہی ہونا چاہئے تھا، یہ بالکل منطقی اور طبعی بات ہے، اگر کسی کسی کو مانتے ہیں اور اس کے اندر کوئی اثر تسلیم کرتے ہیں خواہ وہ کسی درجۂ کسی نوع کا ہو، زندگی کے شعبوں میں سے کوئی شعبہ ہو، اس کو لے لیجئے، سیاست کو لے لیجئے تعلیم کو لے لیجئے، قانون کو لے لیجئے، معالجہ کو لے لیجئے، تصنیف و تالیف کو لے لیجئے، شاعری کو لے لیجئے، ادبیات کو لے لیجئے، اگر آپ اس میں کسی کا کوئی امتیاز مانتے ہیں تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ وہ متعدی ہے، وہ زبان ہی کیا جو سمجھی ہی نہ جائے، وہ چراغ ہی کیا جس کی روشنی نہ پھیلے، وہ خوشبو کیا جس کا سونگھنے والے کو لطف نہ آئے، وہ آفتاب کیا جس کی دھوپ نہ ہو، روشنی نہ ہو، وہ چاند کیا جس کی چاندنی نہ ہو، وہ بارش کیا جس سے تراوٹ اور جس سے آبیاری نہ ہو، جس سے فصلیں پیدا نہ ہوں، جس سے باغات سرسبز نہ ہوں۔

شیعوں کا کھلا تضاد:

شیخ الاسلام امام ابن تیمیہؒ نے امام شعبیؒ کا ایک بلیغ ارشاد نقل کیا ہے کہ یہودیوں سے پوچھا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت میں سب سے بہتر لوگ کون ہوئے؟ انہوں نے کہا کہ جنہوں نے حضرت موسیٰ کے دامن تربیت میں پرورش پائی، جنہوں نے ان کو دیکھا اور ان کو ان کی صحبت ملی وہ سب سے بہترین انسان تھے، عیسائیوں سے پوچھا گیا کہ ملت عیسوی میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں میں سب سے بہتر لوگ کون ہیں؟ انہوں نے کہا حضرت عیسیٰ کے حواری، شیعوں سے پوچھا گیا کہ اس امت میں (امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں) سب سے بدترین لوگ کون ہیں؟ تو انہوں نے ان کا

نام لیا جو اولین اور اہم ترین صحابۂ رسول تھے، خلفائے راشدین (حضرت علیؓ کو مستثنیٰ کر کے) عشرہ مبشرہ اور جلیل القدر صحابہؓ۔

یہ ایک تضاد ہے، ایک پہیلی ہے جو بوجھنے والی نہیں ہے کہ سب پیغمبروں کے سب سے بہتر لوگ تو وہ تھے جو ان کے دامن تربیت میں پلے بڑھے اور جنہوں نے ایک بار زیارت کر لی کچھ سے کچھ ہو گئے، تحت الثریٰ سے ثریا تک پہنچ گئے، چہ جائیکہ وہ لوگ جنہوں نے برسوں پیغمبر کی صحبت پائی، اور وہ براہ راست ان کے فیض یافتہ تھے، تو یہودیوں کا جواب ٹھیک تھا، مسیحیوں کا جواب ٹھیک تھا، ان کے شایان شان تھا، پیغمبر پر ایمان رکھنے والی امت کو یہی کہنا چاہئے تھا، لیکن ہمارے ان بھائیوں اور ہم وطنوں کو جو اسلام کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کا یہ جواب عجیب وغریب ہے، یہ ایک پہیلی ہے، جو بجھائی نہیں جاسکتی، آج بھی پوچھنے والے کو یہ جواب مل سکتا ہے خدا اس کی نوبت نہ لائے، کسی کو پوچھنے کی ضرورت پیش نہ ہو، لیکن وہ گویا زبان حال سے اپنے طرز عمل سے یہ کہتے ہیں، ان کی تصنیفات اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے زیادہ ناقابل اعتبار بہت ہی کچے اور خام لوگ یہی تھے، جو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی دین سے نکل گئے، جو اشخاص آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے، آغوش نبوت میں تربیت پائی، جن کی ہر وقت نگرانی ہوتی تھی، جو آپ کو دیکھ کر نماز پڑھتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا جو کلام آتا تھا وہ براہ راست آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنتے تھے اور پھر اس کی تشریح بھی سنتے تھے اور اس پر عمل ہوتے بھی دیکھتے تھے، اور جن کے اخلاق اعمال وکردار اور ہر چیز کی نگرانی ہوتی تھی، نگاہ نبوت خود ان چیزوں کا جائزہ لیتی تھی،

وہی سب سے ناکام نکلے، خام نکلے، یہ ایک تضاد ہے، ایک شخص کا تضاد نہیں ہے، دینی امتوں کو سامنے رکھئے، اس کا ایک تضاد ہے، دوسرے انبیاء کے ماننے والے یہ کہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے یہ کہیں۔

اگر صحابہؓ کا ایمان معتبر نہیں تو ہمارے ایمان کی کیا گارنٹی ہے؟

مجھے یورپ وامریکہ جانے کا اتفاق ہوتا ہے، کئی بار میں نے کہا کہ اسلامک سینٹر واشنگٹن ڈیسی میں یا لندن کے ہائیڈ پارک میں اگر اسلام کی دعوت دی جارہی ہو اور بڑی سحر انگیز تقریر کی جارہی ہو، لوگ مست ہورہے ہوں اور ایک جادو سا معلوم ہو رہا ہو، اور قریب ہو کہ لوگ اسلام لے آئیں، اسلام کا اعلان کردیں۔

ہمیں توبہ کرائیے، اسلام میں داخل کیجئے، اچانک ایک شخص کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے، ٹھیک ہے آپ نے بہت اچھی بات کہی، لیکن آپ ہم سے کیا امید رکھتے ہیں، آپ کو ہم پر امید رکھنے کا حق کیا ہے، اگر آج ہم اسلام لے آئیں تو اسلام پر قائم بھی رہیں گے؟ جو لوگ براہ راست اللہ تبارک وتعالیٰ کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر اسلام لائے اور مشرف بہ اسلام ہوئے، اور آپ کے سایہ میں تربیت پائی، ایک دن نہیں، دو دن نہیں، چند مہینے نہیں، چند سال نہیں، ۱۳ سال مکہ معظمہ کے اور دس سال مدینہ منورہ کے گزارے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام سے نکل گئے، صرف دو چار، سات آدمی رہ گئے، تو آپ ہم سے یا امید رکھتے ہیں؟ اور آپ اپنے کو کیا سمجھتے ہیں؟ کہ آپ کا مقام پیغمبر خدا سے بلند ہے، ہم آپ کے ہاتھ پر اسلام لائیں تو اسلام پر قائم رہیں گے، اور اسلامی تعلیمات پر عمل کریں گے؟ ہم نے کہا اس کا کوئی جواب نہیں، دنیا کے

بڑے سے بڑے ذکی اور بڑے سے بڑے حاضر جواب کے پاس بھی اس کا جواب نہیں، یہ کیا تضاد ہے، ایک طرف تو آپ یہ کہتے ہیں کہ نبی کے ہاتھ پر براہ راست اسلام لانے والے وہ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿لقد رضي الله عن المؤمنين إذ يبايعونك تحت الشجرة فعلم ما في قلوبهم فأنزل السكينة عليهم﴾۔ (سورۃ الفتح:۱۸۷)

(اے پیغمبر) جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے، تو خدا ان سے خوش ہوا اور جو (صدق وخلوص) ان کے دلوں میں تھا، وہ اس نے معلوم کرلیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی۔

صحابہؓ کا سراپا شریعت کے مطابق تھا:

دوسری طرف انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ بند ہوتے ہی اسلام کو خیر باد کہہ دیا، ایں چہ بوالعجبیت!

دوسری بات یہ کہنی ہے کہ آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جہاں اور دوسری خصوصیات سنیں، اس خصوصیت کو بھی آپ ذہن نشین کرلیں، دماغ میں بٹھائیں، یہاں سے لے کر جائیں کہ وہ دین کے پورے متبع تھے، وہ دین کے سانچہ میں ڈھل گئے تھے، ان کے عقائد ان کی عبادات، ان کے معاملات، ان کے اخلاق، ان کے رسومات ان کی تقریبات، ان کی فتوحات، ان کی حکومت ونظام سلطنت، سب چیزیں اور زندگی کے سب شعبے شریعت کے مطابق تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ خواجہ الطاف حسین حالی کے درجات بلند فرمائے، کیا بات کہی ہے انہوں نے

رہ حق میں تھی دوڑ اور بھاگ ان کی
فقط حق پہ تھی جس سے تھی لاگ ان کی
بھڑکتی نہ تھی خود بخود آگ ان کی
شریعت کے قبضہ میں تھی باگ ان کی
جہاں کردیا نرم نرما گئے وہ!
جہاں کردیا گرم گرما گئے وہ!

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صرف عقائد وعبادات میں مسلمان نہیں تھے، معاملات اور اخلاق میں بھی مسلمان تھے، رسوم اور زندگی کے جو فطری تقاضے اور فطری ضرورتیں ہیں ان میں بھی تھیں، ہم مسلمانوں کا حال کیا ہے، کچھ لوگ تو ایسے ہیں جو عقائد میں دین کے پابند ہیں، الحمدللہ توحید کے بارے میں ان کا ذہن صاف ہے، رسالت کے بارے میں، معاد کے بارے میں اور جو بنیادی عقائد ہیں لیکن عبادات میں کچے ہیں، اور بہت سے وہ ہیں جو عقائد وعبادات میں تو پختہ ہیں، عقائد بھی صحیح، عبادات کے بھی پابند، لیکن معاملات اور اخلاق کو نہ پوچھئے، معاملات اور اخلاق میں سخت ناقابل اعتبار کسی سے معاملہ پڑے گا تو خیانت سے نہ چوکیں گے، معاملہ پڑے گا تو ''تطفیف'' (تطفیف کیل) سے کام لیں گے، ناپ تول میں کمی کریں گے، تجارت کریں گے، اور اس میں مشارکت ہوگی تو اس میں ناانصافی اور خیانت کے مرتکب ہوں گے، کسی کا پڑوس ہوگا تو ان سے اذیت پہنچے گی، حدیث میں آتا ہے:

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده[1]، **لا يومن احدكم**

(۱) صحیح بخاری: ۱۰۔

حتى يامن جاره بوائقه[1]

مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ (کی اذیت) سے مسلمان محفوظ و مطمئن رہیں۔ تم میں سے کوئی مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک اس کا پڑوسی اس کی اذیت سے، اس کے گزند سے محفوظ نہ ہوجائے۔

سب صحابہؓ میزان عدل اور معیارِ حق تھے:

تو ایک طبقہ ایسا ہے کہ نہ پوچھئے، اس نے معاملات واخلاق کو بالکل دین سے خارج کررکھا ہے، یہ سمجھ رکھا ہے کہ بس عقائد وعبادات ہی ضروری ہیں، باقی اخلاق ومعاملات میں بسا اوقات غیر مسلموں سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں، نہ معاملہ کی صفائی، نہ وعدہ کی پابندی، نہ امانت کا خیال، نہ انصاف کے ساتھ تقسیم، کوئی چیز نہیں، حقوق العباد نہیں، اہل قرابت واہل حقوق کے بارے میں بالکل آزاد، جن لوگوں کے ساتھ ان کا معاملہ پڑتا ہے ان کے ساتھ بالکل آزاد، تجارت میں بھی، زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی من مانی کارروائی کرتے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حال ایسا نہیں تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم عقائد سے لے کر اخلاق ومعاملات تک بالکل ترازو کی طرح جو کسی کی رعایت نہیں کرتی، کسی کو ترجیح نہیں دیتی، وہ سب میزان عدل تھے، وہ سب معیارِ حق تھے، ان کی کوئی چیز شریعت کے راستہ سے ہٹی ہوئی نہیں تھی، ان کا کوئی عمل شریعت کے راستہ سے ہٹا ہوا نہیں تھا۔

مدینہ کی زندگی:

غور کرنے کی بات ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ۱۳ سال مکہ معظمہ میں رہے اور

---

[1] الفتح الرباني، ۱۱/۵۳۹۲.

دس سال مدینہ منورہ کو منور فرمایا، لیکن اس کثرت سے مسلمان اسلام میں داخل نہیں ہوئے جتنے صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے درمیان دو سال کے عرصہ میں۔

امام زہریؒ جو سید التابعین ہیں، سیکڑوں، ہزاروں حدیثیں ان سے مروی ہوں گی وہ فرماتے ہیں کہ: صلح حدیبیہ سے لے کر فتح مکہ تک جو دو سال کا عرصہ ہے اس میں جس کثرت سے مسلمان ہوئے ہیں اتنی تعداد میں بیس سال میں مشرکین اسلام میں داخل نہیں ہوئے۔

وجہ کیا تھی؟ وہ دیوار (جنگ اور خوف) کی جو صلح حدیبیہ سے پہلے حائل تھی، ہٹ گئی، صلح و امان ہو جانے کی وجہ سے آنے جانے کا راستہ صاف ہوا، اور کوئی خطرہ نہیں رہ گیا، کیونکہ صلح ہو گئی تھی اور عہد ہو گیا تھا کوئی مسلم غیر مسلم پر حملہ آور نہ ہوگا، اب وہ عزیز یاد آئے، اور عزیز اپنے عزیزوں سے ملنے مدینہ طیبہ آنے لگے، ماموں بھانجوں سے ملنے آرہے ہیں، بھانجے ماموں سے، چچا بھتیجوں سے، بھتیجے چچا سے ملنے آرہے ہیں، بہنوئی اور آپس کے جو رشتہ دار ہیں وہ ایک دوسرے سے ملنے آرہے ہیں، پہلے جو آپس کے رشتہ دار ملنے کو ترس گئے تھے، خون کا رشتہ تھا، قرابتیں تھیں مگر مدینہ جانا خطرہ سے خالی نہ تھا، اب یہ ڈر نہیں رہا، وہ باطمینان مدینہ آئے، انہوں نے یہاں دیکھا کہ دنیا ہی بدلی ہوئی ہے، نہ یہاں جھوٹ ہے نہ گالی گلوچ ہے، نہ غصہ آتا ہے، نہ یہاں ناپ تول میں کمی، نہ یہاں کسی کی حق تلفی ہوتی ہے، نہ دنیا طلبی ہے، نہ دنیا پرستی، اللہ کے علاوہ نہ یہاں کسی کا خوف ہے، نہ یہاں کسی کی لالچ ہے، دنیا بدلی ہوئی ہے، انہوں نے دیکھا کہ بچوں کو سلا کر ان کے سامنے کھانا رکھ دیا جاتا ہے، ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے جس کی طرف قرآن شریف کا اشارہ ہے۔

"ویؤثرون علیٰ أنفسهم ولو كان بهم خصاصة". (سورة الحشر:۹)

اوران کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو۔

حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کی مہمان نوازی:

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں مہمان آئے، یہ کاشانۂ نبوت تھا، دوسروں کو کھلانا اور خود فاقہ سے رہنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کوئی ہے جو ان مہمانوں کو اپنے گھر لے جائے اور کھانا کھلائے، حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے اس کو قبول کیا اور گھر لے گئے، ان کی اہلیہ صاحبہ نے کہا مہمانوں کو لے تو آئے ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ آپ پر رحم کرے، یہاں تو کھانے کو اتنا ہے کہ بچے کھالیں، انصاری صحابی (رضی اللہ عنہ) نے کہا، پہلے تو بچوں کو سلا دینا اور کھانا لے جا کر رکھ دینا، چراغ جل رہا ہوگا، اس کو کسی بہانہ سے ہاتھ لگانا کہ بجھ جائے پھر ہم اپنا کام کرلیں گے، یہی ہوا کہ اس اندھیرے میں حضرت ابوطلحہؓ ہاتھ بڑھاتے رہے اور خالی ہاتھ منہ تک لاتے رہے، مہمانوں نے کھالیا اور حضرت ابوطلحہؓ بھوکے رہے، اللہ تعالیٰ نے اس پر وہ آیت نازل فرمائی جو میں نے پڑھی۔

ہماری معاشرتی زندگی اور اسلام کا مطالبہ:

حضرات! قرآن مجید کی آیت ہے:

"يا أيها الذين آمنوا ادخلوا في السلم كافة". (سورة البقرة: ۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں صلح میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

ریزرویشن کے ساتھ نہیں کہ اتنا دھڑ ہم آگے کرتے ہیں مسجد میں، اور اتنا پیچھے رہے گا، ہاتھ بڑھاتے ہیں دایاں، بایاں پیچھے رہے گا، یہ نہیں، یہ کوئی طریقہ نہیں ہے، اللہ جل شانہ مطالبہ کرتا ہے، اسلام مطالبہ کرتا ہے کہ پورے کے پورے داخل ہو جاؤ، میں صفائی

سے کہتا ہوں اور اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ صاف کہوں کہ ہم مسلمانوں کی معاشرت، ہم مسلمانوں کے شادی بیاہ کے طریقے، ہم مسلمانوں کے وراثت کے طریقے، ہم مسلمانوں کے معاملات شریعت سے دور ہیں اور بہت دور ہیں، اس میں ہم بالکل آزاد ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کیا تھی؟ میں ایک واقعہ سناتا ہوں، آپ کے یہاں شادی کس دھوم دھڑاکے کے ساتھ ہوتی ہے، ہمیں بھی لوگ یاد کرتے ہیں، نیوتے جو آتے ہیں انہیں دیکھ لیجئے اسی میں سینکڑوں اور بسا اوقات ہزاروں ہزار روپے خرچ ہوتے ہوں گے، اور اب تو انگریزی میں آنے لگے ہیں، بڑے شاندار، لوگ ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ ہم نے کہاں سے سیکھا؟ ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے نسبت کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کے لئے مجلسیں منعقد کرتے ہیں، ان کے مناقب وفضائل سناتے ہیں، ان کے لئے لڑنے مرنے کے لئے تیار ہیں، لیکن ہم ان کی اقتدا نہیں کرتے، ہمارا معاشرہ، ہماری سماجی زندگی، ہمارے شادی بیاہ، ہماری تقریبات، ہمارا عائلی قانون (Personal Law) بالکل آزاد ہے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے نکاح کا عجیب واقعہ:

دیکھئے! حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں ایک مرتبہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے ہیں، میں بتادوں آپ کو مدینہ طیبہ میں اس وقت مردم شماری ہوئی تھی، گنتی ہوئی تھی تو اس وقت مدینہ طیبہ میں دو ڈھائی ہزار مسلمان تھے، اور شروع کا واقعہ ہے (ہجرت کے وقت کا) ۱۰۔۱۲ سو مسلمان ہوں گے تو قاعدہ ہے کہ جب ایک جگہ کے آدمی کہیں جاتے ہیں تو بالعموم ایک ساتھ رہتے ہیں، ہندوستان سے جو

لوگ پاکستان گئے وہ زیادہ تر کراچی میں رہے اور اکثر ایک محلہ میں رہے یا لاہور میں رہے تو زیادہ تر ایک محلہ میں رہے، وہ مرتبہ کو پہچانتے ہیں، مقام کو پہچانتے ہیں کہ کس حیثیت کا آدمی ہے اور تھا، مہاجرین کے بارے میں یقین ہے سب قریب قریب ٹھہرے ہوئے تھے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ آپ حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاص طور سے محسوس ہوا کہ آج خوشبو بہت لگی ہوئی ہے عطر لگا کے آئے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا عبدالرحمٰن خیریت ہے، کیا بات ہے؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نے شادی کی ہے، نکاح کیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لفظ نہیں فرمایا، میں حدیث کا طالب علم ہوں، حدیث کے دفتر میں ایک ایک چیز، حرکات وسکنات سب محفوظ ہیں، اس حدیث کے ذخیرہ میں کہیں یہ نہیں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لفظ بھی شکوہ کا فرمایا ہو، عبدالرحمٰن یہ بے مروتی، اتنی جلد بھول گئے، شادی کے موقع پر ہمیں یاد بھی نہیں کیا؟

صحابہؓ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کا اثر اور ہماری بدحالی:

اور یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ مہاجرین آپس میں بہت قریب تھے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف بھی قبیلۂ قریش کے فرد تھے اور معلوم نہیں کتنے رشتے رہے ہوں گے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حرف بھی نہیں کہا، عبدالرحمٰن اتنی جلدی بھول گئے یہاں فاصلہ ہی کیا تھا، ہمیں خبر بھی نہیں کی، اور پھر دیکھئے اللہ تعالیٰ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہو، کسی شہر اور بستی میں کون گیا سے گیا گزرا مسلمان ہے، نبی تو نبی ہے وہ تو اللہ تعالیٰ کے بعد آخری درجہ کی چیز، کوئی بزرگ ہو تو چاہیں گے کہ وہ ضرور نکاح پڑھائے، نکاح نہ پڑھائے تو نکاح کی مجلس ہی

میں شریک ہو، ان کے قدم ہی ہمارے یہاں آجائیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا بھی نہیں، فرماتے کہ میں یہاں موجود تھا تم نے بلایا بھی نہیں لیا، مجھے دعوت بھی نہیں دی، مجھے اطلاع نہیں دی۔ لیکن حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو جو تربیت حاصل ہوئی تھی اس کا تقاضا تھا کہ ایسے کاموں کیلئے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا وقت نہیں لینا چاہئے اتنی دیر میں معلوم نہیں کتنے لوگ مشرف بہ اسلام ہوں گے، کتنے لوگ ہدایت یافتہ ہوں گے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا کر تکلیف دوں اور کتنوں کو محروم کروں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ فرمایا: "اولم ولو بشاۃ" (1) (دیکھو ولیمہ ضرور کرنا چاہئے ایک ہی بکری سے کیوں نہ ہو) یہ بھی نہیں فرمایا کہ ہمیں بلانا، یہ کیا فرماتے، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے کی بات ہی نہیں تھی، جو بات شکایت کرنے کی تھی وہ تو کی نہیں۔

آج لکھنؤ جو اتنا بڑا شہر ہے، شہر کے اس حصہ پر بالکل آخری کنارہ پر کوئی شادی ہو، تو اس کنارہ کے آدمی کو اور اب تو پاکستان تک سے ہمارے پاس نیوتے آتے ہیں اور یہاں کے وہاں جاتے ہیں اور دوسرے شہروں سے آتے ہیں، نہ بلایا جائے تو شکایت کرتے ہیں، ایسی بے مروتی! بالکل ہمیں بھول گئے تم، فہرست ہی میں نہیں تھے تمہاری۔

صحابہؓ کی زندگی کو اپنے لئے نمونہ بنائیں:

یہ تھی زندگی صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی، یہ زندگی ہم نے چھوڑ دی ہے، میں یہ کہنا چاہتا ہوں آپ سے کہ صحابہ کرامؓ کی محبت کا، عقیدت کا اور ان کے تذکرہ کا، ان کے نام لینے کا، ان کی طرف سے نسبت کرنے کا حق ہے کہ آپ ان کی پوری زندگی اپنے لئے نمونہ بنائیں،

---

(1) صحیح بخاری: ۵۰۷۲۔

یہ نہیں کہ صرف ان کی حمایت میں جوش میں آجائیں، اور مدح صحابہؓ کا جلوس نکالیں، ان کے نام پر بڑے بڑے جلسے کریں، لیکن عمل کا جہاں تعلق ہے، زندگی کا تعلق ہے، وہ بالکل اس سے علیحدہ، شادی بالکل اپنے طرز پر اور اس سے بڑھ کر جہیز کی لعنت، یہ جہیز کے مطالبے اور اس پر بے گناہ عورتوں کو بیاہی ہوئی دلہنوں کو مار ڈالنا، معاف کیجئے گا میں اخبار پڑھتا ہوں، مسلمانوں کے واقعات آتے ہیں تو لرز جاتا ہوں اللہ اپنے عذاب اور غضب سے بچائے، محض پیسے کی محبت میں کہ تم اسکوٹر لے کر نہیں آئیں، تم موٹر لے کر نہیں آئیں، تم فلاں چیز لے کر نہیں آئیں، بہت کم زیور لے کر آئیں۔

دنیا کی محبت برائیوں کی جڑ ہے:

چند ہفتے پہلے "قومی آواز" میں لکھنؤ کا واقعہ چھپا تھا، آپ کے کسی قریبی محلہ کا، اور دوسرے شہروں کا تو چھپتا رہتا ہے، ہماری ہمسایہ قوم کو تو پوچھئے نہیں کہ بس اللہ تبارک وتعالیٰ ان کو اور ہم سب کو ہدایت دے، ان کے پیشواؤں کو یہ سمجھ دے کہ مسلمانوں کو نصیحت کرنے کے بجائے اور رام جنم بھومی کے لئے جان دینے کے بجائے اپنے فرقہ کے آدمیوں کو بنائیں، اپنے فرقہ کو دولت کی پرستش (پوجا) سے نکالیں، ہمارے یہاں بھی ایسے واقعات پیش آتے ہیں وہ چیزیں جن کا اس سے پہلے تصور بھی نہ تھا وہ پیش آرہے ہیں، یہ سب پیسے کی بدولت اور اس سے حد سے بڑھی ہوئی محبت کا نتیجہ ہے، حدیث شریف میں آتا ہے:

"حب الدنيا راس كل خطيئة-"[1] دنیا کی محبت ہر گناہ اور ہر عیب کی جڑ ہے آپ نے بالکل اس مرض پر انگلی رکھ دی۔

---

[1] الجامع الصغير: ٣٦٤٦.

صحابہ کرامؓ کی عقیدت کو اپنے دلوں میں جاگزیں کرلیں:

سامعین کرام! یہاں کا تحفہ، یہاں کا حق اور یہاں کا تقاضہ ہے، آپ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عقیدت کو اپنے دل میں جاگزیں کرلیں اور یہ سمجھیں کہ پوری آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، انبیاء کرام علیہم السلام کے بعد کوئی ان کے درجہ کا نہیں ہوسکتا اور نہ ہوا ہے، دوسری بات یہ ہے کہ ان کی اقتدا کرنے کی کوشش کریں ساری چیزوں میں عقائد وعبادات میں، اخلاق ومعاشرت میں، معاملات وتعلقات میں، زندگی بھی ویسے ہی سادہ ہو، ویسے ہی ہمسایوں کا حق پہچانیں، قرآن کریم، حدیث شریف اور اسلامی تعلیمات پر عمومی طریقہ پر عمل کریں، کسی صحابی کے یہاں کبھی کوئی چیز تیار ہوتی تو اسے قریب کے گھر میں بھیجا جاتا، وہ گھر اپنے قریبی گھر میں بھیجتا، آخر میں وہ تحفہ اسی کے گھر میں آجاتا، جہاں سے چلا تھا، اس سے بڑھ کر کیا کہ میدان جنگ میں بالکل جاں بلب پڑے ہوئے ہیں، بھائی اپنے سسکتے ہوئے بھائی کے لئے پانی لاتا ہے کہ گرمی کا زمانہ ہے، گرم ملک ہے جس کی فضا بھی گرم، ان کی خدمت میں پیالہ پیش کیا ہے، وہ کہتے ہیں میں نے ابھی ایک آواز سنی ہے اپنے بھائی کی ان کو دو، ان کے پاس لے جایا جاتا ہے وہ کہتے ہیں میں نے ابھی آواز سنی ہے اپنے پاس کے ایک زخمی کی، ان کو دو، پھر ان کے پاس آتا ہے وہ اشارہ کرتے رہے تو جب ان کے پاس آتا ہے تو وہ دم توڑ چکے، پھر واپس جب دوسرے کے پاس آتا ہے وہ بھی دم توڑ چکے ہوتے ہیں اور پانی کسی کے حصہ میں نہیں آتا۔

ہندوستانی مسلمان غیر مسلموں کے سامنے زندگی کا اعلیٰ نمونہ پیش کریں:

یہ ساری چیزیں ہمارے لئے قابل تقلید ہیں، بلکہ واجب التقلید ہیں کم سے کم زندگی

کو سادہ زندگی بنایئے، یہ شادی بیاہ کی رسمیں جو ہم نے اپنے غیر مسلم ہم وطنوں سے ہندوستان میں آکر سیکھی ہیں وہ واپس کیجئے اور اسلامی معاشرت اختیار کیجئے، اسراف سے بچئے، دھوم دھام سے بچئے اور شان وشوکت اور تعریف سے، کہ کیسے دھوم سے شادی ہوئی ہے، کیسے دھوم سے ولیمہ ہوا ہے، کیسا جہیز ملا ہے، ان سب چیزوں سے اسی طریقہ سے آپ اپنی افادیت ثابت کیجئے، اپنا امتیاز ثابت کیجئے، ملے جلے محلّہ میں مشترک محلّہ میں ہمارے غیر مسلم بھائی پہچانیں، انگلی اٹھائیں، یہ ہمارے مسلم بھائی ہیں، کم سے کم ایک محلّہ میں ایک مسلمان ہو اور سب کو اطمینان ہو، اس محلّہ میں آفت نہیں آئے گی، یہاں بلا نہیں آئے گی، یہاں کوئی چوری کی ہمت نہیں کرے گا، وہ اپنی عورتوں اور بچیوں کے بارے میں، وہ اپنے مال ودولت اپنی پونجی کے بارے میں، وہ اپنی عزت کے بارے میں مطمئن ہوں کہ یہاں مسلمان رہتا ہے، یہ ہمیں ہندوستان میں نمونہ دکھانا چاہئے تب جا کر یہاں اسلام پھیلے گا، آپ کو وہ مقام ملے گا، آپ کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور آپ کی وجہ سے لوگوں میں اسلام کے بارے میں اچھا خیال اور اچھا تصور پیدا ہوگا۔

صحابہ کرامؓ کے طرز زندگی کو اختیار کریں:

میں آپ کو یہ پیغام دے کر جا رہا ہوں اور یہ امانت آپ کے سپرد کر رہا ہوں اور آپ کے ذمہ گویا ایک ذمہ داری سپرد کر کے جا رہا ہوں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام لینے کا تقاضہ اور اس کا حق ہے، کیا معلوم کہ کہیں ہمارے بزرگ اور اسلاف کرام قیامت کے دن ہمارا دامن نہ پکڑیں کہ تم نام ہمارا لیتے تھے اور کام دوسرے طرح کے کرتے تھے، تمہاری شادیاں کس طرح ہوتی تھیں، تمہارے گھر کی زندگی کیسی تھی، تم حقوق العباد کا کتنا

خیال رکھتے تھے، تم کس قدر امانت دار تھے، تم کس درجہ خوش معاملہ تھے، تم کسی درجہ شیریں زبان تھے، تم کس درجہ بلند اخلاق تھے، یہ ان کو پوچھنے کا حق ہوگا، خدا کرے اس کی نوبت نہ آئے، ہمیں اور آپ کو اور سب کو اپنی اصلاح کرنی چاہئے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرنی چاہئے، وہ ہے تو بہت اونچا مقام لیکن جس درجہ ہو سکے ان کو اپنے لئے نمونہ بنانا چاہئے، اور پوری زندگی اس سانچہ میں ڈھالنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

عقائد و عبادات، اخلاق و معاملات، سیرت، معاشرہ، عائلی قانون، گھر والوں کے ساتھ تعلقات، پڑوسیوں کے حقوق، شہر میں رہنے کا طریقہ شہری زندگی، شہری زندگی گزارنے کا طریقہ، اور ملک کے ساتھ تعلق، یہ ساری چیزیں ہمیں اسلام کی تعلیمات اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے نمونہ کے مطابق کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اللہ جل شانہ ہمیں آپ کو اس کی توفیق دے۔ آمین۔

خلفائے اربعہ کی ترتیب خلافت میں قدرت وحکمت الٰہی کی کارفرمائی اور حضرات حسنینؓ کے اقدام میں امت کے لئے رہنمائی (۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی رسولہ الأمین

---

(۱) یہ تقریر اس سے پہلے بھی ایک رسالہ کی شکل میں شائع ہو چکی ہے، جس پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ نے یہ تحریر لکھی تھی، اور اس تقریر کی افادیت کو واضح کیا تھا: "پیش نظر رسالہ میں راقم کی ایک بسیط وطویل تقریر پیش کی جارہی ہے جو اس نے ۱۵ محرم الحرام ۱۴۱۲ھ (مطابق ۲۸ جولائی ۱۹۹۱ء) کو مولانا عبدالشکور ہال واقع احاطہ شوکت علی، لکھنؤ میں ان جلسوں کی آخری نشست میں کی تھی جو "شہدائے اسلام" کے عنوان سے ہر سال محرم کے مہینہ میں "دارالمبلغین لکھنؤ" کے زیر اہتمام منعقد ہوتے ہیں، اور ہندوستان کے مشاہیر علمائے اہل سنت کو ان میں تقریر واظہار خیال کی دعوت دی جاتی ہے، راقم کو اس سے پہلے ایک مرتبہ حضرت امام اہل سنتؒ کی حیات میں ان کی دعوت پر اور اُن کی وفات کے بعد ایک سے زائد بار اس مجمع عظیم کو خطاب کرنے کا موقعہ اور سعادت حاصل ہوئی، جو ان جلسوں میں شرکت کے لیے لکھنؤ وبیرون لکھنؤ سے آکر جمع ہوتا ہے۔ آگے تحریر فرماتے ہیں:

حضرات! خلفائے راشدین (رضی اللہ تعالی عنہم) کے بارے میں ایک فرقہ نے جو ایک خاص منفی وسلبی رویہ اختیار کر رکھا ہے، اور حضرات حسنینؓ کے بارے میں قریبی زمانہ سے بعض اہل سنت، اہل قلم اور مقررین کی طرف سے جس غیر مناسب ناقدانہ اور بعض اوقات جارحانہ رویہ کا نمونہ اور مثالیں سامنے آنے لگی ہیں، ان کو سامنے رکھ کر ضرورتاً واختصاراً اس تقریر میں صفائی اور طاقت کے ساتھ اظہار خیال کیا گیا ہے، اور مسلمانوں اور اہل سنت کو بالعموم اس مسئلہ میں توسط واعتدال اور جامعیت کی دعوت دی گئی ہے، جو ہمیشہ سے اہل سنت کا امتیاز وافتخار اور قابل استناد علماء ومحققین اور پیشوایان دین کا وصف اور شعار رہا ہے۔

محمد وآله وصحبه أجمعين، ومن تبعهم بإحسان ودعا بدعوتهم إلى يوم الدين۔ أما بعد!

أعوذ بالله من الشيطن الرجيم

"والشمس تجري لمستقر لها، ذلك تقدير العزيز العليم" (سورة يٰسن: ۳۸)

اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ آفتاب اپنے مستقر کی طرف (اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے طلوع اور غروب کی جو جگہ متعین کی ہے) بے اختیارانہ بڑھتا اور اس کی طرف چلتا رہتا ہے، اور یہ اس مالک کا مقدر کیا ہوا اور بنایا ہوا نظام وحساب اور اس کا قانون ہے، جو "العزیز" بھی ہے، "العلیم" بھی، غالب بھی ہے، اور علم والا بھی، نظام بنانے والا اور حساب مقرر کرنے والا بھی، اگر کوئی صرف غالب ہو تو ضروری نہیں کہ اس کا نظام وحساب حکمت پر بھی مبنی ہو، وہ محض اپنی قوت سے کام لیتا ہے، لیکن اس کی ساری کارروائی اور کارفرمائی ضروری نہیں کہ حکمت پر مبنی ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حکم دینے والا علیم ہو، لیکن غالب نہ ہو تو سارا کام پورا ہونا مشکل ہے۔

ترتیب خلافت منجانب اللہ ہے:

حضرات! آپ کو تعجب ہوگا کہ آج کے اس جلسہ سے جس کا تعلق صحابہ کرام اور شہدائے اسلام کے فضائل ومناقب سے ہے، اس آیت مبارکہ کا کیا تعلق ہے، جس میں نظام شمسی کا ذکر کیا گیا ہے کہ آفتاب اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے ایک خاص جگہ سے چلتا ہے، اور ایک خاص جگہ پہنچتا ہے، اور وہ اپنا پورا سفر اللہ کی قدرت اور اس کے علم کے مطابق طے کرتا ہے؟

میں یہ عرض کروں گا کہ اس آیت کی روشنی اور رہنمائی میں جس میں نظام شمسی کا ذکر ہے، آفتاب رسالت، آفتاب دین حق، آفتاب دین ودعوت کے نظام شمسی کے انضباط اور اپنے مقاصد کی تکمیل کو بھی سمجھا جاسکتا ہے، ان کا معاملہ بھی یہی ہے کہ اس میں اتفاقات کوئی چیز نہیں ہیں، وہ سب اللہ کے منشاء اور اس کے حکم کے مطابق اور اس کی حکمت کے عین موافق گردش کرتے ہیں، اور اس کے تابع ہوکر ان کا نظام چلتا ہے۔

آپ اس نظام نیابت کو دیکھیں جو "خلافت راشدہ" کے لقب سے مشہور ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دنیا سے سفر کرنے کے بعد جو شخصیتیں مسند خلافت پر آئیں اور پھر جس ترتیب کے ساتھ مسند خلافت پر متمکن ہوئیں، اور اللہ تعالیٰ نے فرائض خلافت ادا کرنے کا جو موقع ان کو عطا فرمایا یہ بالکل "ذلك تقدير العزيز العليم" کا مظہر ہے، اس سلسلہ کو اللہ تعالیٰ نے ایسی ترتیب اور ایسے نظام کے ساتھ چلایا کہ وہ اس کی رحمت واسعہ، اس کی حکمت بالغہ اور اس کی قوت قاہرہ کی ایک مثال ہے۔

تمام مفکرین اگر جمع ہوجائیں تب بھی اس سے بہتر ترتیب نہیں سوچ سکتے ہیں:

دنیا کے مذاہب وادیان اور اقوام وملل اور فلسفۂ تاریخ پر نظر رکھنے والے مفکرین اگر کہیں جمع ہوں اور ان کو اس کا پورا اختیار دیا جائے کہ وہ اپنے تاریخی تجربہ اور مذاہب وادیان اور اقوام وملل کے اسباب زوال وارتقاء کے مطالعہ کی مدد سے اس سے بہتر ترتیب قائم کریں، تو میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں، اور تاریخ اور فلسفۂ تاریخ کے ایک طالب علم اور خاص طور پر ادیان وملل کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے فرد کی حیثیت سے پورے دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ وہ اس سے بہتر ترتیب سوچ نہیں سکتے اور اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، اکثر ایسا ہوا

ہے کہ کوئی عہد گزر گیا ہے، یا ملوک وسلاطین کا کوئی سلسلہ مکمل مختتم ہو چکا ہے، کوئی سلسلہ حکومت یا شاہی خاندان اپنی مدت ختم کر چکا ہے، بعد میں فلسفۂ تاریخ پر نظر رکھنے والے جو لوگ آئے اور انہوں نے ان کی ترتیب پر اس ترتیب کے نتائج پر اور پھر ملک ومعاشرہ پر پڑنے والے اس کے اثرات پر غور کیا تو ان کو کہیں نہ کہیں یہ کہنے کا موقعہ ضرور مل گیا کہ اگر ایسا ہوا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا، فلاں کے بعد اگر فلاں آیا ہوتا تو زیادہ اچھا ہوتا، اگر وہ پہلے نمبر پر ہوتا تو زیادہ مفید ثابت ہوتا، اگر وہ دوسرے نمبر پر آیا ہوتا تو زیادہ بہتر ثابت ہوتا، اور پھر جیسا کہ کسی کہنے والے نے کہا ہے کہ ایک حرف "کاش" ایسا ہے کہ مجھے سو جگہ لکھنا پڑا ہے ع

یک حرف کاشکیست کہ صد جا نوشتہ ایم

وہ بھی سو جگہ لکھنے پر مجبور ہوتا کہ کاش ایسا ہوتا، کاش ویسا ہوتا، میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ صرف مسلمان ہی نہیں دنیا کی دوسری قوموں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات اور مغربی اقوام کے بہترین مفکرین، تاریخ داں اور فلاسفہ اور بڑے بڑے مبصرین جمع ہو کر اسلام کے عہد اول کی تاریخ کا مطالعہ کریں اور ان کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ وہ اپنے ذہن ودماغ سے اور اپنے تاریخی مطالعہ کی روشنی میں اس دین کی حفاظت کرنے والوں، اور اس کو دنیا میں پھیلانے والوں کا ایک چارٹ تیار کریں اور ایک نقشہ بنائیں کہ کس کو کس کے بعد آنا چاہئے تھا، تو میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس سے بہتر چارٹ بنا نہیں سکتے۔

حفاظت دین سب سے اہم کام ہے:

مذاہب وادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ دین کے لئے جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے (میں ریڑھ کی ہڈی نہیں کہوں گا، اس کے لئے یہ روح کا درجہ رکھتی ہے) وہ اس دین

کی حفاظت کا کام ہے، اس کا لانے والا، اس کا حامل اول اس کو جس طرح لایا ہے، اور اس میں جس چیز کا جو مقام ہے اور جس چیز کا جو درجہ، اور اس کی جو ترتیب ہے، اس کے مطابق اس کا جانشین اس کو قائم رکھے، اور اس میں ذرا بھی تبدیلی کا روادارانہ ہو، یہ سب سے ضروری اور اہم کام ہوتا ہے، مذاہب کی تقدیر کا اس پر انحصار ہوتا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد (اس دین کے اولین لانے والے کے بعد) کون اس کی جگہ لیتا ہے کہ دین اپنی اصلی حالت اور صحیح ترتیب پر، اور اسکی تعلیمات اپنی اہمیت کے مطابق اپنے مقام پر قائم وباقی رہیں؟

ایمان کامل کے بعد، معرفت الٰہی کے بعد، اور توحید خالص کے بعد دنیا میں جو بہترین اوصاف ہو سکتے ہیں، اور نفسیات انسانی کے ماہرین اور مراتب کمال کے نبض شناسوں نے جو اعلیٰ ترین اوصاف تجویز کئے ہیں وہ سارے اوصاف اور وہ سارے کمالات ایک طرف رکھے جائیں ان میں سب سے زیادہ کسی مذہب کے بقا کے لئے (میں ارتقاء نہیں کہتا، ارتقاء تو بعد کی چیز ہے) جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے، وہ ہے جذبہ حفاظت، اور نبی کی تعلیمات کے بارہ میں شدید غیرت، میں تقویٰ کا ذکر یہاں نہیں کرتا، خلفاء اربعہ بلا کسی استثناء کے تقویٰ کے ایسے اعلیٰ ترین مقام پر فائز تھے، جس کا تصور بھی بڑے بڑے مفکروں اور تقویٰ شناسوں کے لئے مشکل ہے، میں ان کے علم اور ان کی ذہانت کا بھی ذکر نہیں کرتا، میں ان کی انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کے جذبہ، اور ان کی نیک نفسی، خدا ترسی اور انسان دوستی کا بھی ذکر نہیں کرتا، پہلی چیز اور پہلی شرط جو ہے، وہ یہ کہ پیغمبر کی پہلی جگہ لینے والا اور اس کی نیابت اولیٰ کا فرض انجام دینے والا، اس دین وشریعت کے معاملہ

میں اتنا غیور ہو کہ اس سے بڑھ کر غیور، اس سے بڑھ کر ذکی الحس، اس سے بڑھ کر خوددار وحساس، اس کے ایک ایک نقطہ کی حفاظت کا جذبہ رکھنے والا کوئی دوسرا نہ ہو۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سب سے بڑی صفت حفاظت دین کا جذبہ تھا:

دوسری صفات بعد کی ہیں اور اپنی اپنی جگہ پر ان سب کا مقام ہے، لیکن پہلی شرط جس پر دین کی بقاء کا انحصار ہے وہ یہ کہ نبی کا جانشین، اس کا نائب، اس کی جگہ پر امت کی رہنمائی کا منصب سنبھالنے والا جو کچھ بھی ہو اپنی جگہ پر، لیکن دین کے معاملہ میں وہ حد درجہ غیور ہو، وہ اپنے گھر والوں اور اپنی بہو بیٹیوں کی عزت وآبرو کے مقابلہ میں بھی اس دین کے ایک ایک نقطہ کے بارے میں زیادہ غیور، زیادہ باحمیت اور ذکی الحس واقع ہوا ہو، سارے مذاہب وادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ سب سے زیادہ یہ مذاہب اس وجہ سے تحریف کا شکار ہوئے اور انہوں نے بہت جلد اپنی شکل بدل دی اور ایک دوسرے راستہ پر پڑ گئے کہ ان مذاہب کو اپنے لانے والوں کے بعد (لاکھوں درود سلام ہوں ان پر) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا محافظ وامین اور وفادار وغیور جانشین نہیں ملا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کس مرتبہ کے انسان تھے؟ ان کی صفات، ان کی سیرت وسوانح کی کتابوں میں پڑھئے، وہ کن کمالات کے حامل تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں کیا فرمایا، ان کو کس درجہ کی فضیلت حاصل ہے، ان پر امت کو کتنا اتفاق ہے، یہ سب حدیث اور سیرت کی کتابوں میں دیکھا جاسکتا ہے، لیکن ان کی سب سے بڑی اور غالب صفت جس کی پہلے مرحلہ میں سب سے بڑھ کر ضرورت تھی، وہ ان کی دین کے بارے میں حد سے بڑھی ہوئی غیرت، ذکاوتِ حس، اس کے

ایک ایک نقطہ کی حفاظت کا جذبہ اور منشائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تکمیل کا غیر متزلزل عزم و فیصلہ تھا۔

مسلمانوں کا وجود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خلافت اولیٰ کا رہین منت ہے:

ان کا خدا کے ساتھ جو تعلق تھا، وہ اپنی جگہ پر، ان کی راتوں کی گریہ وزاری، ان کی دعائیں، اور خلق خدا پر ان کی شفقت اور ان کا عدل وتقویٰ، ان کا زہد وایثار، وہ صفات وخصوصیات ہیں، جو اپنی جگہ پر بڑی قدر و قیمت کی حامل ہیں، مگر حفاظت دین اور اسکے بارہ میں شدید غیرت، یہ ان کا وصف خاص اور ان کی سیرت کی کلیدی صفت ہیں، جس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ آج دین پر جو عمل ہو رہا ہے، فرائض اور شرعی احکام زندہ ہیں، دین تحریف اور امت کلی طور پر ضلالت سے جو محفوظ ہے، یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ علیہ اللہ عنہ کی اسی حفاظت دین کے جذبہ کا نتیجہ اور ظہور ہے، خدا کے فضل سے آج بھی خدائے واحد کے ماننے والے موجود ہیں، بنیادی عقائد پر ایمان رکھنے والے اور فرائض کے پابند ہیں، جن کے بغیر کسی مسلمان کا مسلمان رہنا مشکل ہے، یہ سب رہین منت ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت اولیٰ کا اور میں کیا چیز ہوں میری کیا حیثیت ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جن سے زیادہ حدیث کے راویوں میں کسی سے روایات منقول نہیں اور جن کی عدالت وصداقت پر امت کا اتفاق ہے، وہ فرماتے ہیں:

"واللہ الذی لا إلٰہ إلا ہو لولا أن أبا بکر استخلف ما عبد اللہ"[۱]

لوگوں نے کہا دیکھئے آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے پھر کہا۔

---

[۱] البدایة والنهایة، ج/٦، ص: ٣٠٤.

"واللّٰه الذی لا إلٰه إلا هو لولا أن أبا بکر استخلف ما عبد اللّٰه"

(خدا کی قسم جس کے سوا کوئی معبود نہیں اگر حضرت ابوبکرؓ مسند خلافت پر متمکن نہ ہوتے تو دنیا میں خدائے واحد کی عبادت واطاعت کا سلسلہ جاری نہ رہتا)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایمان سے لبریز تاریخی جملہ:

بات کیا تھی؟ بات یہ تھی کہ حضرت ابوبکرؓ دین کے بارے میں ایسی غیرت رکھتے تھے، جو غیرت عزت وآبرو کے بارے میں ہوتی ہے، اور یہی ان کا سب سے بڑا وصف تھا، اور یہی ان کا اصل جوہر جس کی اس وقت سب سے زیادہ ضرورت تھی، ان کے اس وصف کو ان کا وہ جملہ بتاتا ہے، جس کو تاریخ نے انہیں کے لفظوں میں نقل کیا ہے، اور وہ جملہ خود بول رہا ہے کہ وہ کس دل سے نکلا ہے، اور کس ایمان ویقین کے ساتھ نکلا ہے، وہ جملہ ہے۔ "أینقص الدین وأنا حي" (میرے جیتے جی دین میں کتر بیونت ہوسکتی ہے؟) میری آنکھوں کے سامنے اللہ کے دین میں ایک حرف کیا ایک نقطہ کی بھی کمی ہوسکتی ہے؟

یہ ہے وہ چیز جس کی مذاہب وادیان کو سب سے پہلے ضرورت پڑتی ہے اور یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ میں بدرجۂ کمال موجود تھی۔

اب میں آپ کے سامنے اس دینی غیرت وحمیت اور ذمہ داری کے بڑھے ہوئے احساس کی دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا الہامی فیصلہ:

وفات نبوی ﷺ کے بعد ہی جزیرۃ العرب میں فتنۂ ارتداد اٹھا، اب کچھ ایسی نئی تحقیقات سامنے آئی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اس فتنۂ ارتداد میں باہر کے یہودیوں اور

عیسائیوں کا بھی ہاتھ تھا، ابھی تک یہ بات تاریخ کی روشنی میں نہیں آئی تھی[1]۔ انہوں نے یہ کوشش کی کہ وہیں جزیرۃ العرب میں ایک ایسی انتشار پسند وانتشار انگیز تحریک پیدا ہو جس سے اسلام کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی ایمانی وحدت، اعتقادی وحدت، ذہنی وحدت، قلبی وحدت اور اخلاقی وحدت ختم ہو جائے، یہ فتنہ شروع ہوا، جو لوگ اسلام کا کلمہ پڑھتے تھے، اور نماز ادا کرتے تھے، زکوۃ کے بارہ میں ایک گروہ اس کی فرضیت کا بالکل منکر ہو گیا اور اس نے نماز وزکوۃ میں تفریق کی، دوسرے فریق نے کہا کہ ہم زکوۃ بیت المال کو ادا نہیں کریں گے، بلکہ اپنے طور پر اس کی ادائیگی کا انتظام خود کر لیا کریں گے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے اولوالعزم صحابی کو بھی تامل تھا، اور یہ تامل ان کے احتیاط اور تقویٰ پر مبنی تھا، نہ کہ کسی کمزوری کی وجہ سے کہ جب یہ لوگ کلمہ پڑھتے ہیں، نماز ادا کرتے ہیں اور اسلام کا انکار بھی نہیں کرتے تو ان سے جنگ کیسے کی جائے؟ لیکن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کہا "واللہ لأقاتلن من فرق بين الصلاة والزكوة، فإن الزكوة حق المال"۔[2] (بخدا میں اس سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوۃ کے بارے میں مختلف رویہ اختیار کرے گا کہ نماز پڑھے گا اور زکوۃ نہ دے گا، اس لئے کہ زکوۃ مال کا حق ہے) اور یہ بھی فرمایا کہ "ایک رسی بھی اگر کوئی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں دیا کرتا تھا، اگر نہ دے گا، تو میں اس سے بھی

---

(۱) استاد محمد جمیل مصری کی کتاب "أثر أهل الكتاب في الفتن الداخلية والحروب الأهلية في القرن الأول" سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قبائل عرب کا ارتداد اور مُسیلمہ کذاب کا دعوائے نبوت اتفاقی اور خود رو پودے نہیں تھے، جو خود سے اُگ آئے ہوں، جیسے برسات کے موسم میں اُگ آتے ہیں، اس فتنہ کو بھڑکانے میں یہودی، عیسائی اور مجوسی ذہن کام کر رہا تھا، اور وہ ان لوگوں کے پشت پناہ تھے، اور اُس کے شواہد ملتے ہیں۔

(۲) صحیح بخاری: ۱۳۹۹۔

جنگ کروں گا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک طرف تھے اور اچھے اچھے لوگوں کو تامل تھا، یہ خالص الہامی بات تھی، اللہ کو دین کو چونکہ باقی رکھنا تھا، لہٰذا انہوں نے کہا کہ نہیں یہ نہیں ہوسکتا، اگر اس میں تساہل برتا گیا، اور زکوٰۃ کے بارے میں ڈھیل دی گئی تو کل حج کی باری ہے، روزہ کی باری ہے، پھر نماز کی باری ہے، اور پھر عقیدہ کی باری ہے، اور یہ سلسلہ رکتا نہیں، انہوں نے دنیا کی تاریخ کا مطالعہ نہیں کیا تھا، لیکن یہ الہامی بات تھی جو خدا نے ان کے دل میں ڈالی تھی، کیونکہ اس دین کو اللہ تعالیٰ کو قیامت تک باقی رکھنا تھا، کیسی کیسی قوموں کو اس میں داخل کرنا تھا، کن کن بلندیوں تک اس کو پہونچانا تھا، لہٰذا اللہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ بات ڈالی کہ اگر اس وقت ذرا بھی تساہل برتی گئی اور ذرا بھی رعایت کی گئی تو دین باقی نہ رہے گا، اور وہ بالکل ادیانِ سابقہ عیسائیت اور یہودیت کی طرح محرف ہوکر رہ جائے گا، چنانچہ وہ اپنے موقف پر اڑ گئے اور انہوں نے جہاد کیا اور اس جہاد میں خود بھی جانے کا ارادہ کیا، لیکن سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے جاکر رکاب تھام لی کہ ہم آپ کو جانے نہیں دیں گے اور یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلوص اور محبت کی کھلی ہوئی دلیل ہے، انہوں نے یہ خیال کیا کہ اگر خدانخواستہ کوئی واقعہ پیش آگیا تو اسلام کے شیرازہ کو مجتمع کرنے والی کوئی طاقت نہیں، یہ خلوص کی اعلیٰ ترین مثال ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بات مان لی اور حضرت خالد بن ولیدؓ، بہت سے صحابہ اور حفاظ قرآن کو جنگ کے لئے روانہ کیا، اتنی بڑی تعداد میں حفاظ قرآن کو بھیجا کہ ڈر ہوا کہ اگر یہ حفاظ جنگ میں کام آگئے تو یہ قرآن کیسے باقی رہیگا؟ لیکن وہ اڑ گئے، خدا کی مدد ان کے ساتھ تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فتنۂ ارتداد ختم ہوا، دعویداران نبوت مارے گئے اور اب یہ واقعہ صرف تاریخ کی ایک امانت رہ

گیا ہے، وہ بھی پڑھے لکھے لوگوں کے لئے، بہت سے لوگ شاید ایسے ہوں گے جو پہلی مرتبہ اس واقعہ کا ذکر سن رہے ہوں گے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا یہ کارنامہ خلافت نبوت کا مظہر اول ہے:

ہم اس واقعہ کی اہمیت اور اس کی سنگینی کا اندازہ نہیں کر سکتے، وہ عرب جو اسلام سے قریب العہد تھا، ابھی اللہ کے رسول نے وفات پائی تھی، اور دنیا سے آخرت کا سفر فرمایا تھا، ایک طرف رومن امپائر تھا، جو تقریباً نصف متمدن دنیا پر قابض تھا، دوسری طرف ساسانی سلطنت تھی، پھر عیسائیت، یہودیت اور مجوسیت جیسے مذاہب تھے، اور یہاں ہندوستان میں ہندو مذہب اور بودھ مذہب تھا، ان سب کی موجودگی میں اسلام اپنی اصل شکل میں کیسے باقی رہا، یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا کارنامہ ہے، اور یہ کارنامہ خلافت نبوت کا مظہر اوّل ہے، انہوں نے کہا خواہ کچھ ہو، میں دین کے ایک نقطہ سے دستبردار ہونے کے لئے بھی تیار نہیں ہوں، نتیجہ یہ ہوا کہ آج یہ دین اسی شکل میں باقی ہے، میں آپ کو بتاتا ہوں کہ دوسرے مذاہب کا کیا حال ہوا، میں اس وقت صرف دنیا کے ایک وسیع ترین مذہب عیسائیت کا ذکر کروں گا۔

موجودہ عیسائیت کا بانی سینٹ پال ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں:

یہ عیسائیت جس کا دنیا میں ڈنکا بج رہا ہے اور جو دنیا کے متمدن ترین اور ترقی یافتہ خطوں میں حکومت کر چکی ہے، بحیثیت مذہب کے بھی اور بحیثیت اپنے علمبرداروں کے بھی، اس عیسائیت کا یہ حال ہے کہ نصف صدی کی مدت کے اندر بھی یہ اپنی اصلی حالت پر قائم نہ رہ سکی، اب کتابیں نکل رہی ہیں، ابھی حال ہی میں Ernest De Bensen

کی کتاب جس کا نام ہے Islam Or True Christianity شائع ہوئی ہے، اس میں صاف صاف لکھا ہے:

"موجودہ عیسائیت کسی بھی طرح حضرت مسیح علیہ السلام کی پیش کی ہوئی عیسائیت نہیں ہے، یہ وہ عیسائیت نہیں جس کی دعوت اور اشاعت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کی تھی یہ عیسائیت سینٹ پال کی بنائی ہوئی عیسائیت ہے"۔

عیسائیت ایک تحریف شدہ مذہب!

آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ سینٹ پال اور حضرت مسیح علیہ السلام کے درمیان صرف ۶۰، ۶۵ برس کا فصل ہے، ان چند برسوں میں عیسائیت کا یہ حال ہوا کہ اس نے رومی اثرات اور بودھ مذہب کے بہت سے تصورات قبول کر لئے، اور اگر آپ مذاہب کی انسائیکلو پیڈیا اور عیسائیت پر لکھی گئی دوسری کتابیں دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ عیسائیت نے رومی دیو مالا اور بودھ مذہب کی کتنی چیزیں مثلاً تمثل، اتحاد وحلول کو اور کتنے ان عقائد ونظریات واقدار کو جو ہندوستان کے مذاہب سے تعلق رکھتے تھے، قبول کیا، اور بالکل محرف ہو کر رہ گئی اور برابر اسی راستہ پر چل رہی ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت کا اقرار کیے بغیر ہم مسلمان نہیں ہو سکتے:

یہ قرآن کریم کا معجزہ ہے کہ اس نے عیسائیوں کے لیے "**الضالین**" کا لفظ استعمال کیا ہے، ضالین کے معنی کیا ہیں؟ آپ کلکتہ جانا چاہتے ہوں اور دہلی جانے والی گاڑی پر بیٹھ جائیں، یہ ہے ضلال، آپ بجائے اس جلسہ گاہ میں آنے کے ریلوے اسٹیشن چلے جائیں، اس کو کہتے ہیں راستہ بدل دینا اور پھر اسی راستہ پر چلتے رہنا، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا

ہے کہ آدمی جتنا زیادہ چلتا ہے منزل مقصود سے اتنا ہی دور ہوتا چلا جاتا ہے، عیسائیت تیز چلی اور اب تو ہوائی جہاز پر جارہی ہے (ہوائی جہاز بھی اسی کے پیروؤں کی دین ہے) تو یہ عیسائیت صرف زمین کے رقبہ میں نہیں اپنے مذہبی اور دینی سفر میں بھی ہوائی جہاز کی رفتار سے چلی، یعنی چل کر منزل مقصود سے دور نہیں ہوئی بلکہ اڑ کر دور ہوئی، آج کی موجودہ مسیحیت بالکل دوسری مسیحیت ہے، جس کو سینٹ پال کا تحفہ اور اس کی دین کہنا چاہئے، اور وجہ اس کی یہ ہے (مجھے معاف کیا جائے اور خدا بھی مجھے معاف کرے) کہ عیسوی مذہب کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسا پاسبان اور خلیفہ نہیں ملا، اب یہ اللہ کی حکمت تھی، اور کوئی اس پر اعتراض نہیں کرسکتا، اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے، اس کی ذات غنی ہے، اس نے حضرت مسیح علیہ السلام پر دوسرے، بہت سے انعامات فرمائے، حضرت مسیح حضرت مسیح ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے، اور ان کی نبوت کا اقرار کئے بغیر ہم مسلمان نہیں ہوسکتے، لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، اس کو چونکہ عیسائیت کو قیامت تک باقی رکھنا مقصود نہ تھا **"ليظهره على الدين كله"** (سورة التوبة: ٣٣) اس کے لئے نہیں کہا گیا، **"اليوم أكملت لكم دينكم وأتممت عليكم نعمتي ورضيت لكم الإسلام دينا"** (سورة المائدة: ٣) کی بشارت اس کو نہیں دی گئی، ایک یہودی عالم نے حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے کہا کہ "اے امیر المؤمنین! ایک آیت قرآن مجید میں آپ آسانی سے پڑھ لیا کرتے ہیں، اگر کہیں وہ آیت ہم یہودیوں کے بارے میں نازل ہوتی تو ہم اس دن کو تہوار بنالیتے، آپ نے فرمایا کون سی آیت؟ اس نے کہا **"اليوم أكملت لكم دينكم...... إلخ"** (سورة المائدة: ٣) ۔ فرمایا کہ یہ آیت رکھے رکھائے تہواروں میں

ہی نازل ہوئی تھی، یہ تو یوم عرفہ میں نازل ہوئی تھی، اور وہ دن بھی جمعہ کا تھا(۱) ہم لوگ اس طرح کے تہوار منانے کے عادی نہیں، ہمارے یہاں یہ طریقہ رائج نہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امتیازی شان:

یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کارنامہ تھا کہ وہ دین کے ایک نقطہ کو بھی چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ کرامات چاہے ایسی ہوں کہ آدمی ہوا میں اڑے، اور زبان ایسی ہو کہ جو بات نکلے پوری ہو جائے، اور نظر ایسی کہ جس پر پڑے مسلمان ہو جائے اور ولی کا درجہ پائے، سب چیزیں اپنی جگہ مسلم اور قابل اعتراف ہیں، مگر جہاں تک دین کے باقی رہنے کا تعلق ہے، تو سب سے اہم اور بنیادی چیز جو ہے وہ یہ کہ اس کے بارے میں غیرت اور اس کی حفاظت کا جذبہ سب پر غالب ہو، یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی شان تھی، اور اس میں وہ ساری امت میں ممتاز ہیں، کسی دوسرے مسئلہ میں کسی کا وصف ان سے نمایاں ہو، اس سے انکار نہیں کرتا، لیکن اس معاملہ میں ان کا کوئی مثیل نہیں۔

حضور ﷺ کی تمنا اور وصیت کا خیال:

آپ کا دوسرا نمونہ یہ ہے کہ جس وقت آپ مسند خلافت پر بیٹھے تو آپ کو یہ بات معلوم تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری خواہشات اور تمناؤں میں یہ بات شامل تھی کہ حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو رومیوں سے جنگ کرنے کیلئے بھیجیں، ادھر فتنۂ ارتداد پھیلا ہوا تھا، اور صرف دو تین مقامات ایسے بچے تھے جہاں نماز ہو رہی تھی، پورا جزیرۃ العرب خطرہ میں اور ارتداد کی زد پر تھا، اور اس بات کا اندیشہ تھا کہ اگر یہ ارتداد کچھ اور پھیلا تو پورا جزیرۃ العرب اسلام کی دولت سے محروم ہو جائے گا، اور مسلمانوں کی جو کچھ بھی فوجی طاقت تھی، وہ

جیش اسامہ میں تھی، اور یہ وہ لشکر تھا جس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رومیوں سے مقابلہ کرنے کے لئے تیار کیا تھا، لیکن اس کو بھیجنے کی نوبت نہیں آئی، اور آپ اس دنیا سے رحلت فرما گئے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس نازک موقع پر فرمایا کہ میں یہ لشکر بھیجوں گا، کبار صحابہؓ نے سمجھایا کہ اے خلیفۂ رسول اللہ! یہ وقت اس لشکر کے بھیجنے کا نہیں، کیونکہ جو کچھ بھی ہمارے پاس فوجی طاقت ہے وہ یہی لشکر ہے، اگر اس لشکر نے مدینہ سے باہر قدم رکھا تو یہ قبائل جو ہماری تاک میں ہیں ہم پر حملہ آوار ہو جائیں گے، لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم میں اس لشکر کو روانہ کر کے رہوں گا، اس لئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تمنا اور وصیت تھی، اور میں اس کو پورا کر کے رہوں گا، اس کے بعد ایسے الفاظ کہے جن کو میں آپ کے سامنے صاف طریقے سے بیان نہیں کر سکتا، یعنی یہاں تک کہہ دیا کہ ہمارے گھروں اور گھر والوں کی سلامتی اور حفاظت پر بھی اثر پڑ جائے اور وہ خطرہ میں پڑ جائیں جب بھی میں اس وصیت پر عمل کر کے رہوں گا، اس لئے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اللہ کی ساری نصرت اور اس کی قدرت کاملہ کا ظہور اور نظام عالم کو بدل دینے کی اس کی عادت اور سنت ظاہر ہوتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی منشاء کی تکمیل کی صورت میں نہ کہ اس کو ملتوی رکھنے میں یہ ان کا دین کا فہم تھا اور قرآن مجید کا مطالعہ۔

عرب قبائل پر اس واقعہ کا اثر:

چنانچہ یہ واقعہ تاریخ میں ہے کہ ادھر اس لشکر نے مدینہ طیبہ سے قدم نکالا اور ادھر سارے عرب قبائل پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی کہ او ہو اب بھی مسلمانوں کے یہ دم خم ہیں کہ ان حالات میں بھی رومیوں سے آنکھیں ملانے کے لئے تیار ہیں، اور لشکر جا رہا ہے، ہم لوگ کیا

ہیں۔ہم غیر منظم قبائل ہیں، ہمارے پاس وہ ہتھیار بھی نہیں، وہ عسکری تنظیم بھی ہم نہیں جانتے، جب وہ رومیوں سے لڑ سکتے ہیں تو ہم کیا چیز ہیں، ان پر دھاک بیٹھ گئی اور بالکل الٹا اثر ہوا۔

یہ ہے اخلاص کا نتیجہ اور یہ ہے دین کے فہم اور حقیقی نیابت، نبوت کا کارنامہ، کہ سب ڈر رہے تھے، بڑے بڑے صحابہ ڈر رہے تھے، یا اللہ خیر کرے، ابوبکرؓ مانتے نہیں، اسامہؓ کا لشکر باہر بھیج رہے ہیں، وہ باہر نکلا تو لوگ سمجھیں گے کہ اب یہ لوگ بالکل لاوارث ہیں، کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں، اس سے بہتر موقعہ ہو نہیں سکتا اور وہ مدینہ پر چڑھائی کردیں گے، لیکن اس کا بالکل الٹا اثر ہوا اور تمام مؤرخیں نے بالا اتفاق لکھا ہے کہ پورے عرب پر دھاک بیٹھ گئی اور سہم گئے۔

تکمیل دین تقدیر الٰہی کا مظہر ہے:

یہ تھی پہلی بات اور دیکھئے یہی ہے تقدیر الٰہی، اور "**ذالك تقدير العزيز العليم**" (سورہ یٰس: ۳۸) سے میں اسی کی طرف اشارہ کر رہا ہوں، آپ روز سورج کو مشرق سے نکلتے اور مغرب میں ڈوبتے دیکھتے ہیں، یہی تنہا اللہ کے قہار ہونے اور حکیم وغالب ہونے کی دلیل نہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ آفتاب رسالت کے اللہ تعالیٰ نے جو منازل مقرر کئے اور جن منازل سے اس کو گزارا، اور جس طرح اس نے دین کو تکمیل تک پہنچایا، اور جس طرح اس کے جانشین مہیا کئے اور اپنے نبی کو جو خلفاء دیئے یہ بھی "**ذالك تقدير العزيز العليم**" کا مظہر ہے۔

آج تاریخ میں فتنہ ارتداد کا صرف نام باقی ہے:

!ب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا کام پورا ہوا اور فتنہ ارتداد ایسا ختم ہوا کہ آج صرف تاریخ میں اس کا نشان باقی ہے، یہ صرف اللہ کی قدرت تھی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ

عنہ کی عزیمت جو اللہ ہی کی دی ہوئی تھی، اور اس کے نبی کی تربیت کی ہوئی تھی کہ وہ ارتداد کا فتنہ ختم ہو گیا، ورنہ پورے جزیرۃ العرب کا نام تاریخ میں اس حیثیت سے آتا کہ وہاں تھوڑے دن کے لئے اسلام ظاہر ہوا تھا، اور وہاں ایک ایسی ہستی پیدا ہوئی تھی جو اپنے آپ کو نبی کہتی تھی، اور اسکے بعد کچھ دن وہ دین چلا، اور اس کی صرف ایک تاریخ رہ جاتی۔

اب دوسرے نمبر پر ضرورت تھی کہ دین تو محفوظ رہ گیا لیکن حاملین دین بھی محفوظ رہیں اور جو داعیان اول ہیں، اور اس کے نمونہ اکمل ہیں، اور جو اس کے عملی پیکر اور اس کا مظہر کامل ہیں، ان کا مزاج بدلنے نہ پائے، بڑی شاندار تاریخ اور ماضی رکھنے والی، اعلیٰ مقاصد کی حامل، مستحکم سیرت وتربیت کی مالک قوموں اور جماعتوں کا حال یہ ہوا ہے کہ فتوحات حاصل کرنے اور متمدن اور باوسائل ذخائر رکھنے والے ممالک فتح کر لینے کے بعد برف کی طرح گھل اور موم کی طرح پگھل گئیں، اور انہوں نے سارے اصول ومعیار سے دستبرداری حاصل کر لی۔

اس وقت کہ روم اور شام اور ایران فتح ہو رہے ہیں، مصر وشام کی دولت امنڈ امنڈ کر آرہی ہے، اور بارش کی طرح برس رہی ہے، جن کو آنکھوں نے کبھی دیکھا نہیں تھا، وہ چیزیں ان کے ہاتھوں میں آرہی ہیں، عربوں کا حال یہ تھا کہ جب انہوں نے پہلی مرتبہ کافور دیکھا تو نمک سمجھ کر کھانے میں ڈالنے لگے، یہ عرب تھے، اونٹوں کے چرانے والے، خیموں میں رہنے والے، اونٹ کا گوشت کھانے اور اس کا دودھ پینے والے، ان کو سابقہ پڑا رومن امپائر سے، ساسانیوں کی سیکڑوں سال پرانی سلطنت سے، جہاں تمدن ارتقاء کے آخری درجہ تک پہنچ گیا تھا، اب خطرہ یہ تھا کہ امت تمدن کے اس سیلاب میں بہہ نہ جائے،

اللہ تعالیٰ اس موقعہ پر ایسی ہستی کو سامنے لایا، جو اس وصف میں سب سے زیادہ ممتاز تھی کہا: نہیں بالکل نہیں، میرے سامنے عربوں کا، امت اسلامیہ کا، مزاج نہیں بدل سکتا، یہ تمدن کا شکار نہیں ہوسکتے، یہ عیش وعشرت میں نہیں پڑسکتے، انہوں نے عربوں کو بڑی تاکید سے سادگی، جفاکشی، شہسواری، زہد وقناعت اور اپنی قدیم نسلی سپاہیانہ ومتقشفانہ خصوصیات کو قائم رکھنے کی ہدایت وتلقین کی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حال:

خود ان کا یہ حال تھا کہ جب آپ "جابیہ" کی طرف سفر کر رہے تھے، تو اس شان کے ساتھ گئے کہ آپ ایک اونٹ پر بیٹھے ہوئے ہیں، جس پر ایک معمولی کپڑا پڑا ہوا ہے، اگر زمین پر لیٹنا ہو تو وہی ان کا بستر ہے، اور اگر اوڑھنے کی ضرورت پڑے تو وہی ان کی چادر، جسم پر ایک موٹے سوتی کپڑے (کرباس) کا کرتہ تھا، جس پر جگہ جگہ سے نشان پڑ گئے تھے، اور جا بجا پھٹا ہوا تھا، بیت المقدس کے سفر میں جہاں آپ کو اس کی چابیاں لینی اور مسلمانوں کی تولیت میں اس کو لینے کا عمل کرنا تھا، راستہ میں پانی پڑا تو کھل کھل کر کے اس کو پار کیا، حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے رہا نہ گیا، عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین! آپ نے یہاں جو مظاہرہ فرمایا یہ مناسب نہیں تھا، یہ رومی جو بڑے ترقی یافتہ اور تمدن سے آراستہ ہیں کہیں گے کہ یہ مسلمانوں کے خلیفۂ اعظم ہیں؟ ان کا حال یہ ہے کہ پانی میں اس طرح کھل کھلاتے چلے آرہے ہیں، آپ کسی معزز سواری پر تشریف لائے ہوتے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات برداشت نہ ہوسکی اور انہوں نے فرمایا:

أوّه، لو غيرك يقولها يا أبا عبيدة! أنتم كنتم أقل الناس وأذل

الناس فأعزكم الله بالإسلام، فمهما تطلبوا العزة بغيره يذلكم الله۔

تخريج شرح السنة، ١٣/١٢٤۔

مذاہب کی تاریخ، وارثین انبیاء کی تاریخ میں ان الفاظ کی مثال نہیں ملتی، انہوں نے کہا کہ اے ابوعبیدہ! تم یہ کہہ رہے ہو؟ اگر کوئی اور یہ کہتا تو ہمیں افسوس نہ ہوتا، دل پر یہ چوٹ نہ لگتی تم جیسا آدمی یہ کہہ رہا ہے، امین الامت! خدا کی قسم تم (اہل عرب) سے بڑھ کر دنیا میں کوئی ذلیل وحقیر وقلیل نہ تھا، ہم کو اللہ نے اسلام کے ذریعہ عزت دی، اب اسلام کے سوا تم جس راہ سے بھی عزت تلاش کرو گے اللہ تم کو ذلیل کرے گا۔ پھر جب وہاں پہنچے تو کہنے لگے، ارے تم نے اتنی جلدی اپنا لباس تبدیل کردیا؟ ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہو؟ تو حضرت عبیدہؓ اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے کہا کہ اے امیر المؤمنین یہ ٹھنڈا ملک ہے، یہاں اس طرح کے کپڑوں کی ضرورت پڑتی ہے اور دیکھئے ہمارے نیچے وہی کپڑے ہیں، انہوں نے کہا کہ اچھا خیر، اس کے بعد کسی پادری کو کرتہ دیا کہ پھٹ گیا ہے ذرا اس کو سی دیں، پادری نے ایک دوسرا قیمتی کرتہ اس کے بدلہ دے دیا، آپ نے فرمایا کہ یہ کیا چیز ہے؟ پادری نے کہا کہ حضرت یہ بڑے اچھے کپڑے (کتان) کا بنا ہوا ہے، آپ نے فرمایا کہ نہیں، ہمارا وہی کرتہ لاؤ، چنانچہ وہ کرتا لایا گیا اور آپ نے اس کو پہنا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا عدل:

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب حاکم ومحکوم کے درمیان وہ فرق ہوتا تھا جو انسان اور جانور سے بھی زیادہ ہوتا ہے، آپ ہندوستان کو دیکھئے، یہاں جو طبقاتی تفاوت تھا، اور اونچی اور نیچی ذاتوں کے درمیان فرق تھا، وہ دیکھئے، منوشاستر پڑھئے، تو آپ کو اس وقت کے حالات کا علم ہوگا۔

لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ جو عدل الٰہی اور مساوات انسانی کے علمبردار تھے، اور ان کو اس صفت کو قائم بھی رکھنا تھا، اور اللہ کو ان کے ذریعہ اس وصف کو اس وقت تک پہنچانا بھی تھا، ان کی عدل گستری اور مساوات انسانی کا صرف ایک واقعہ میں آپ کو سناتا ہوں۔

ایک مرتبہ مصر میں گھوڑوں کی ریس ہو رہی تھی، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ جو مصر کے فاتح اور اس کے گورنر ہیں، ان کے صاحبزادہ اس ریس میں شریک تھے، مقابلہ میں ایک قبطی کا گھوڑا ان کے گھوڑے سے جب آگے بڑھنے لگا تو انہوں نے ایک کوڑا گھوڑے پر لگایا، وہ رک گیا، تو انہوں نے اس قبطی پر بھی ایک کوڑا مارا اور کہا کہ میں ایک شریف زادہ ہوں اور تم مجھ سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہو؟ قبطی نے اس واقعہ کی شکایت حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کی حضرت عمر فاروقؓ نے گورنر صاحب کو اور ان کے صاحبزادہ دونوں کو طلب کیا اور فرمایا کہ تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا، حالانکہ سب اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے، پھر آپ نے اس قبطی کو بلایا اور اس کے ہاتھ میں کوڑا دیا اور حکم دیا کہ اس شریف زادہ گورنر صاحب کے صاحبزادہ کے سر پر ایسا ہی پھیر جیسا کہ انہوں نے تمہارے سر پر پھیرا تھا۔

یہ تھی وہ چیزیں جس کی وجہ سے اسلام میں یہ نظام عدل اور مساواتِ انسانی اور انسانیت کا احترام اور اس کا شرف اور اس کی عزت باقی رہی۔

اب ضرورت تھی کہ اسلامی مملکت قائم رہے!

اب میں آپ کو بتاتا ہوں کہ تیسرے نمبر پر کس چیز کی ضرورت تھی؟ فتنۂ ارتداد ختم ہو چکا تھا، دین میں تحریف کا دروازہ بند ہو چکا تھا، انسانی مساوات اور عدل کا نظام قائم

ہو چکا تھا، اب ضرورت تھی کہ یہ اسلامی مملکت (Empire) قائم رہے، یہ قائم رہے گی تو خیر کا دروازہ کھلا رہے گا، کیسی کیسی قومیں حلقہ بگوش اسلام ہوں گی، کیسے کیسے باکمال افراد پیدا ہوں گے، کیسے کیسے عالم ربانی پیدا ہوں گے، کیسے کیسے ائمہ ومجتہدین پیدا ہوں گے، امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ جیسے، کیسے کیسے محدث پیدا ہوں گے، امام بخاری اور امام مسلم جیسے، کیسے کیسے قانون ساز پیدا ہوں گے، امام ابو یوسف اور امام محمد جیسے، کیسے کیسے فاتح پیدا ہوں گے، عقبہ بن نافع اور طارق بن زیادہ اور محمد بن قاسم جیسے۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں فتوحات:

چنانچہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا انتخاب فرمایا، کیونکہ انہیں کے خاندان کے لوگ زیادہ تر ملکوں کے فاتح اور حاکم ومنتظم تھے، اور یہ انسانی فطرت ہے کہ جب اہل کارانِ سلطنت کا خونی رشتہ بھی ہوتا ہے، نسبی ووطنی رشتہ بھی ہوتا ہے تو وہ اس کو اپنی چیز سمجھتے ہیں، وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ہم محض ملازم ہیں اور جوابدہ ہیں، تو وہ اس وقت اس کے ساتھ خیر خواہی کرتے ہیں، اب یہاں پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی ضرورت تھی، چنانچہ وہ آئے اور تاریخ بتاتی ہے کہ کیسی فتوحات ان کے زمانہ میں ہوئیں، آپ کے زمانہ میں قبرص (Cyprus) افریقہ کا ایک بڑا حصہ، آذر بائیجان، اصطخر، سابور، شیراز، اصفہان، طبرستان، بجستان اور نیشاپور فتح ہوئے۔

خلافت عظمٰی پر فائز اور وسیع مملکت کے حاکم اور ذاتی طور پر فراخ معیشت اور صاحب املاک ہونے کے باوجود دیکھنے والے بیان کرتے ہیں کہ ہم نے دیکھا کہ آپ جمعہ کا خطبہ دے رہے ہیں، اور آپ کے جسم پر ایک موٹی چادر ہے جس کی قیمت چار درہم سے زیادہ نہیں۔

ایسا بار ہا ہوا کہ باہر کے وفود آئے ان کو لذیذ کھانے کھلائے اور خود گھر جا کر نہایت سادہ غریبانہ کھانا کھالیا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے لیکن خون مسلم کا ایک قطرہ بھی نہ بہنے دیا:

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جب محاصرہ ہوا تو آپ نے اگر چہ خلافت سے دستبرداری منظور نہیں کی کہ وہ نبی کی نیابت تھی اور منشاء رسول اور مصالح اسلامی کے مطابق اور اس طرح استقامت وعزیمت کی ایک شاندار نظیر چھوڑی لیکن اپنی سلامتی وحفاظت کیلئے مسلمانوں کے خون کا ایک قطرہ بہانے کی اجازت نہیں دی شہادت سے ایک روز پہلے آپ کے مکان پر سات سو کے قریب مہاجر وانصار جمع ہو گئے، جن میں متعدد جلیل القدر صحابہ بھی تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے کہا کہ جس پر بھی میرا کوئی حق ہے اس کو قسم دیتا ہوں کہ وہ اپنا ہاتھ روک لے اور اپنے گھر چلا جائے، اپنے غلاموں سے فرمایا، جو تلوار میان میں کر لے وہ آزاد ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا طرز خلافت:

اسلام کی طرف سے اب بالکل اطمینان ہو چکا تھا، سیاسی، انتظامی اور عسکری طور پر اب کوئی خطرہ باقی نہ تھا، اب ضرورت تھی کہ مسلمان اتنے دنوں تک حکومت کر چکے تھے، اور تمدن کا اثر پڑنا لازمی تھا، اور سیاسی طرز فکر کا آنا بھی ضروری تھا کہ آدمی سیاسی اقدار (Political Values) کے ذریعہ سوچے اور فیصلہ کرے کہ اس وقت یہ کرنا مناسب ہے اور یہ کرنا نامناسب، سیاسی مصلحت کا تقاضہ یہ ہے اور دین کا مطالبہ یہ ہے۔

اب ضرورت تھی کہ خلیفۂ رابع سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو لایا جائے جن کا اصل وصف اور اصل امتیاز یہ تھا کہ سیاسی اصولوں اور سیاسی منافع اور مفادات پر خالص دینی

اصولوں کو ترجیح دی جائے، اور اس کی ذرا پرواہ نہ کی جائے کہ خلافت ہاتھ میں رہے گی یا نکل جائے گی، نہیں یہ چیز یہاں کے لئے مناسب نہیں، اس کو بدل دینا چاہئے، یہ کام یہاں نہیں ہونا چاہئے، یہاں تک کہ ان کی نظر اس پر بھی تھی کہ اپنے عمال سلطنت کا محاسبہ کرتے تھے، ایک صاحب ایک دعوت میں چلے گئے، ان کے نام خط ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم ایسی دعوت میں گئے ہو، جہاں غریبوں کو ہٹایا جاتا ہے اور امیروں کو بلایا جاتا ہے تم نے وہاں کی دعوت میں شرکت کی اور انواع واقسام کے کھانے کھائے! پھر ان کی آخری زندگی کا یہ حال تھا کہ بعض مرتبہ کوئی مہمان آیا اور اس کو خیال تھا کہ آج امیر المؤمنین کے یہاں آئے ہیں، آج تو خوان نعمت لگے لگا، طرح طرح کے کھانے رکھے جائیں گے، لمبا چوڑا دستر خوان بچھے گا، لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک تھیلی منگوائی، اس پر مہر لگی ہوئی تھی، آپ نے مہر توڑ دی اور اس کو کھولا تو تو اس میں سے ستو نکالا، اس نے کہا کہ اے امیر المؤمنین یہاں تو اس وقت بصرہ اور کوفہ میں لذیذ اور عمدہ کھانوں کی فراوانی ہے، اور آپ ستو کھاتے ہیں؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہاں یہ میرا خریدا ہوا ہے، اور یہی میرا کھانا ہے، میں نے اس پر مہر لگا رکھی ہے تا کہ اس میں کوئی باہر کی چیز داخل ہونے نہ پائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ اور ایک یہودی کا قبول اسلام:

آپ ہی کا واقعہ ہے کہ ایک زِرہ کے معاملہ میں آپ کا عدالت جانا ہوا، آپ کی زرہ ایک یہودی کے ہاتھ لگ گئی تھی، جو کھو گئی تھی، اس کا مقدمہ قاضی کے پاس گیا، اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو ایک فریق کی حیثیت سے عدالت جانا پڑا، آپ اپنے صاحبزادہ حضرت حسنؓ اور غلام کو لے کر عدالت گئے، قاضی صاحب نہ ان کے لئے کھڑے ہوئے اور نہ ان کو

اس جگہ بٹھایا جہاں امیر المؤمنین کو بٹھانا چاہئے تھا، اور جب آپ نے گواہ پیش کئے تو قاضی صاحب نے ان کی گواہی قبول کرنے سے انکار کردیا اور کہا کہ ان میں تو ایک آپ کے صاحبزادہ ہیں اور دوسرے آپ کے غلام، لہٰذا ان کی گواہی معتبر نہیں، آپ نے کچھ نہیں کہا، لیکن وہ یہودی اس واقعہ سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ اسی وقت مسلمان ہوگیا اور کلمہ پڑھا کہ امیر المؤمنین اس طرح قانون پر چلتے ہیں اور اپنی طاقت اپنی شان اور حیثیت سے بالکل کام نہیں لیتے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بے مثال نمونہ پیش کیا:

آپ کے عہد خلافت کی یہ بھی ایک خصوصیت وافادیت تھی کہ آپ نے اس کا نمونہ پیش کیا کہ اندرونی فتنوں، ہم مذہبوں کی مخالفتوں اور انتشار کے دور میں کس طرح اصول پر قائم رہا جاتا ہے اور سیاست دین پر غالب نہیں ہونے پاتی، امام ابوحنیفہؒ نے خوب فرمایا ہے کہ اگر حضرت علیؓ کا دور نہ ہوتا تو ہمیں خیر القرون کی کوئی مثال اور نمونہ نہ ملتا کہ فتنوں اور خود مسلمانوں کی مخالفت کی حالت میں کیا کرنا چاہئے۔ (۱)

حضرات حسنینؓ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں:

یہ تھا وہ جوہر جس کی چوتھے نمبر پر ضرورت تھی، اب میں آپ سے کہتا ہوں کہ اسی طریقہ سے اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ کو جاری رکھا، اور یہی حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا معاملہ ہے، میں صفائی سے آپ سے کہتا ہوں کہ حضرات حسنینؓ کا معاملہ بھی آیات الٰہی اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خدا تعالیٰ کا جو مخصوص معاملہ رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو دنیا کی جو بہتر سے بہتر نعمتیں عطا

(۱) مناقب الإمام الأعظم أبي حنيفة لصدر الأئمة، ج/۲، ص: ۳۸.

فرمائی ہیں، ان میں سے آپ کے یہ دو پھول بھی ہیں، جن کو "ریحانتی رسول اللہ کا لقب ملا ہے۔

حضرت حسنؓ کی حضرت معاویہؓ کے ساتھ صلح و بیعت درحقیقت منشاءِ رسول تھا:

میں اپنے تاریخ کے مطالعہ کی روشنی میں صاف کہتا ہوں کہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ کا اقدام بالکل صحیح تھا جو انہوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں کیا تھا اور پھر خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی طرف دیکھ کر فرمایا تھا:

"إن ابني هذا وسيد وسيصلح الله به بين فئتين من المسلمين"[(۱)]

میرا یہ بیٹا سردار ہے، امید ہے کہ اللہ تعالی اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دو بڑی جماعتوں میں صلح کرادے گا، یہ بات حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے لئے صرف ایک خبر نہیں تھی، بلکہ یہ آپ کے لئے ایک وصیت تھی، منشاء رسول تھا، اللہ کے رسول کا منشاء بھی اور پیارے نانا جان کا منشا بھی، چنانچہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اس کو اپنے لئے خالص حکم نبوی سمجھا اور اس کے مطابق جو اقدام کیا وہ بالکل صحیح تھا کہ معاملہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ تھا، جو صحابی تھے، کاتب وحی تھے، قریبی رشتہ دار تھے، اور کوئی بات موجب خروج اور تلوار اٹھانے کی نہ تھی، ان کے مخالفانہ فوجی اقدام کا نتیجہ خونریزی کے سوا کچھ نہ ہوتا ان کو جب بعض جوشیلے لوگوں نے طعنہ دیا کہ یہ ننگ و عار کی بات ہے تو فرمایا: العار خير من النار"۔

حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے اقدام میں امت کے لئے نمونہ ہے:

اسی طریقہ سے جب معاملہ یزید کا آیا تو میرے نزدیک حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا

---

(۱) الإصابة في تمييز الصحابة، ج/۱، ص: ۲۳، اس کے علاوہ بھی کئی کتب حدیث میں یہ روایت ہے۔

اقدام سوفی صدی صحیح تھا، اور حضرت حسین رضی اللہ عنہ کو یہی کرنا چاہئے تھا، ورنہ قیامت تک کے لئے قرنِ اول کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے نہ ہوتا کہ جب کوئی غلط اقتدار قائم ہو جائے، اور جب معاشرہ کی سیرت و کردار کے تبدیل ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے، جب حکومت بجائے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے اور بجائے تقویٰ اور طہارت پیدا کرنے اور بجائے خدا ترسی اور عبادت کا ذوق بنانے کے سیر و شکار اور تعیش و لذت اندوزی کا ذوق پیدا، اور دولت و اقتدار کا غلط استعمال ہونے لگے تو ہمارے سامنے کوئی نمونہ اس کا بھی ہونا چاہئے تھا کہ کوئی اللہ کا بندہ اُٹھے اور اس کو چیلنج کرے اور اس کے مقابلہ میں آجائے، اگر یہ نہ ہوتا تو آپ اسلام کی بعد کی تاریخ میں دیکھتے کہ وہ ساری کی ساری اس شعر کی تعمیل ہوتی کہ ع

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

جو غلط اقتدار آجاتا، جو غلط حکومت قائم ہو جاتی، ہم بس اُس کے تابع بن جاتے کہ یہی تقدیر الٰہی ہے، ہمارے پاس صدر اول کا کوئی نمونہ نہیں ہے، ہمارے پاس کوئی قابل اقتدار مثال نہیں ہے کہ ہم کچھ کر سکیں، پھر اس میں یہ اندیشہ ہے کہ اس سے اسلامی وحدت پر اثر پڑے گا، مسلمانوں کی اجتماعیت خطرہ میں پڑ جائے گی، سب خاموش تماشائی بنے رہیں گے۔

تمام اصلاحی تحریکات کے پیچھے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نمونہ کارفرما ہے:

اس کے لیے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا نمونہ قائم کیا گیا، کہ نہیں کچھ لوگ ایسے ہونے چاہئیں کہ وہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آئیں اور کسی چیز کی پرواہ نہ کریں، چنانچہ بعد کے مجاہدین کی اگر آپ تاریخ پڑھیں اور ان کی نفسیات کا مطالعہ بھی کریں، اور ان کے مکالمے بھی اگر دیکھیں اور ان کی باتیں بھی سنیں، تو آپ کو معلوم ہوگا کہ

مختلف عہدوں اور ملکوں میں جو اصلاحی تحریکات وجود میں آئیں، اور جو انقلابی کوششیں پروان چڑھیں، ان سب میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ نمونہ کام کر رہا تھا، امیر عبدالقادر جزائری ہوں یا عبدالکریم ریفی، شیخ سنوسی ہوں یا شیخ شامل داغستانی یا سید احمد شہیدؒ، اور شاہ اسماعیل شہیدؒ سب کے حوصلے کو بڑھانے والی، ان کے اندر جذبہ پیدا کرنے والی چیز حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا یہ نمونہ ہے کہ یہ کوئی طفلانہ حرکت نہیں، کوئی اشتعال انگیز، کوئی انتشار پیدا کرنے والی حرکت نہیں، بلکہ حسینی سنت ہے۔

فکر حسینی کے علم بردار:

یہ سلسلہ ہمارے اس دور تک قائم ہے، تحریک خلافت جس کا لکھنؤ ایک بڑا مرکز تھا، اس کے جو سب سے بڑے قائد تھے، یعنی رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر ان کے اندر بھی حضرت حسینؓ کی تقلید کا یہ جذبہ کام کر رہا تھا، وہ کہتے ہیں:

پیغام ملا تھا جو حسین ابنِ علی کو
خوش ہوں کہ وہ پیغامِ وفا میرے لیے ہے

پھر آپ دیکھیں کہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے حضرت زین العابدینؒ کے صاحبزادہ زید بن علی بن حسینؓ جب ہشام بن عبدالملک کے (جو یزید سے یقیناً کچھ بہتر ہی ہوگا) مقابلہ میں کھڑے ہوئے تو امام ابوحنیفہؒ نے دس ہزار درہم جو اس زمانہ کے لحاظ سے اور امام ابوحنیفہؒ کے اعتبار سے (جو ایک مجتہد اور فقیہ تھے، کوئی سرمایہ دار نہیں تھے) بہت بڑا عطیہ ہے، ان کو بھیجے اور کہا آپ اس سے کام لیجئے، اور پھر اس کے بعد جب حضرت محمد ذوالنفس الزکیہ (محمد ذوالنفس الزکیہ کون ہیں؟ محمد ذوالنفس الزکیہ بن عبداللہ المحض بن حسن المثنی بن حسن المجتبیؓ بن سیدنا علی المرتضیؓ)

جب منصور کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے (منصور کون؟ ہارون رشید کا دادا اور بغداد میں خلافت عباسیہ کا بانی) تو تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نے ان کا ساتھ دیا، اور رقم بھی بھیجی، اور حسن ابن قحطبہ کو جو منصور کا جنرل تھا، امام ابوحنیفہؒ نے روک دیا کہ تمہارے لئے جائز نہیں کہ تم محمد ذوالنفس الزکیہ اور ان کے بھائی ابراہیم سے جنگ کرو، یہ دو بھائی تھے محمد بن عبداللہ جو مدینہ میں کھڑے ہوئے اور حدیث موجود ہے کہ میری اولاد میں ذوالنفس الزکیہ ہوگا، جو مدینہ میں احجار زیت میں شہید ہوگا، یہ پیشین گوئی آپ پر صادق آئی، دوسرے بھائی ابراہیم تھے جو بغداد میں کھڑے ہوئے تھے، لیکن تاریخوں کے اختلاف کی وجہ سے ذرا سا فرق ہوگیا، چنانچہ دونوں مل کر مقابلہ نہیں کر سکے، امام ابوحنیفہؒ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے دونوں کا ساتھ دیا اور رقم بھی بھیجی۔

امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کی مثال ملتوں میں نہیں ملتی ہے:

اب اگر کوئی حضرت حسینؓ، زید بن علیؓ اور محمد ذوالنفس الزکیہ کے اس اقدام پر اعتراض کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ جمعیت اسلامی اور اقتدار اسلامی کے خلاف ایک غیر مستحسن اقدام، اور ایک ناعاقبت اندیشانہ عمل تھا، تو وہ گویا یہ کہتا ہے کہ وہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ سے زیادہ فقیہ اور مجتہد ہے اور زیادہ خداترس اور اسلام دوست، اور آپ یہ بھی یاد رکھیں کہ امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ نہ صرف فقیہ اور مجتہد تھے، بلکہ ایسے فقیہ اور مجتہد تھے کہ میں شریعت اور فقہ اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ ملتوں میں ان دونوں کی مثالیں نہیں ملتی، انہوں نے نہیں سوچا کہ اسلامی اقتدار اعلیٰ کے خلاف یہ لوگ قدم اٹھا رہے ہیں؟ ان کے پاس کیا فوجی طاقت ہے؟ اس کا نتیجہ سوائے انتشار کے کچھ نہیں، دونوں نے بالکل خم ٹھونک کر ان لوگوں کی تائید کی۔

اہل سنت کا امتیاز اور امام اہل سنتؒ کا مسلک:

یہ ہم اہل سنت کا امتیاز ہے کہ ہم صحابہ کرامؓ کی عظمت کرتے ہیں، ان کی فضیلت کے قائل ہیں، اور اہل بیت سے محبت رکھتے ہیں، اور اپنے اس سرمایہ پر فخر کرتے ہیں، اور یہ ہال جس کی یادگار ہے،[1] میں خود اس کے متعلق یہ گواہی دیتا ہوں کہ یہی ان کا مسلک تھا، یہی حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے بعد ان کے خاندان کا مسلک تھا، یہی مجدد الف ثانیؒ کا مسلک تھا، میں نے صاف پڑھا ہے کہ جب ان کے والد (حضرت شیخ عبدالاحد سرہندیؒ) کا انتقال ہونے لگا، بالکل سکرات کا وقت تھا، حضرت مجدد صاحب نے کہا کہ ابا جان آپ بہت کہا کرتے تھے، کہ اہل بیت کی محبت کا حسن خاتمہ میں بہت دخل ہوتا ہے، تو فرمایا کہ میں دیکھ رہا ہوں، اور پھر اس جگہ یہ شعر لکھا

الٰہی بحق بنی فاطمہ
کہ بر قول ایمان کنی خاتمہ[2]

ہمارا شعار!

یہ ہمارا شعار ہے ہم کسی قیمت پر بھی اس کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں، ہم خلفائے راشدین کو احق الناس بالخلافۃ اسی ترتیب کے ساتھ اور ان کی اولیت بھی اسی ترتیب کے ساتھ، پہلے خلیفۃ الرسول حضرت ابوبکر صدیقؓ دوسرے نمبر پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، تیسرے نمبر پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ، چوتھے نمبر پر حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ

(۱) امام اہل سنت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی ہال مراد ہیں۔
(۲) زبدۃ المقامات، ص: ۱۲۳۔

ہیں، ہم اس ترتیب کے بھی قائل ہیں، ان کی افضلیت کے بھی قائل ہیں، اور ان کی خلافت کی حقانیت کے بھی قائل ہیں، اس کے ساتھ ہم اہل بیت سے بھی محبت رکھتے ہیں اور ہم حضرات حسنینؓ کے اقدام کو بالکل صحیح سمجھتے ہیں۔

ائمہ اہل سنت کا مسلک اور یزید:

ہمارے تمام قابل اعتماد اور لائق استناد مجتہدین اور ائمہ سب متفق ہیں، یزید کے فعل کی شناعت اور یزید کے فسق پر، امام احمد بن حنبلؒ کے متعلق صاف آتا ہے کہ ان کے صاحبزادہ نے کہا کہ ابا جان کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آپ یزید کو پسند کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ بیٹا جو شخص اللہ تعالیٰ پر اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہو کیا وہ یزید کو پسند کر سکتا ہے؟ صاحبزادہ نے عرض کیا کہ پھر آپ لعنت کیوں نہیں بھیجتے، یزید پر، امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا کہ تم نے اپنے باپ کو کب کسی پر لعنت بھیجتے ہوئے سنا ہے۔

یہی امام ابن تیمیہؒ کا مسلک ہے، جب ان کا مکالمہ تاتاری قائد بولائی سے ہوا تو یزید کے بارہ میں سخت الفاظ استعمال کئے، اور اس سے اپنی براءت کا اظہار کیا اور اس کے فعل کی شناعت بیان کی۔

یہی مسلک تھا حضرت مجدد الف ثانی، شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ اور ہمارے پیشواؤں کا، یہی مسلک تھا امام اہل سنت مولانا عبدالشکورؒ کا، میں ان کو جانتا ہوں کہ ان کو اہل بیت سے کتنا تعلق تھا، اور حضرات حسنینؓ سے کتنا تعلق تھا، یہاں تک کہ ان کے متعلقین تک سے ان کا جو معاملہ تھا، وہ ہم سب جانتے ہیں، اس خصوصیت سے ہم کو کبھی دست بردار نہیں ہونا چاہئے، اور اس کے بارے میں کوئی سودا نہیں کرنا چاہئے، نہ عظمت صحابہؓ کے بارے میں، نہ

خلفائے راشدین کی ترتیب کے بارے میں، اور نہ حضرات حسنینؓ کے فعل کی صحت کے بارے میں، اور نہ ان کے اقدام کے صحیح اور مبارک ہونے کے بارے میں۔

خوارج وروافض نے بے توفیقی کا راستہ اختیار کیا!

خوارج ایک طرف چلے گئے، روافض ایک طرف چلے گئے، بے توفیق تھے وہ، خدا کی نصرت، اس کی رہنمائی اور اس کی ہدایت سے محروم تھے وہ، خوارج نے حضرت علی کی تکفیر کی، اور روافض نے خلفاء ثلاثہ کی تکفیر کی اور ان کے ائمہ جو یہ بات کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھ بند ہونے کے بعد صرف تین آدمی دین پر قائم رہے، اور بقیہ تمام لوگوں نے ارتداد کا راستہ اختیار کیا، معاذ اللہ اس سے بڑھ کر رسول کی ناکامی کا اعلان اور آپ کی رسالت اور آپ کی کیمیا اثر صحبت کی تاثیر کا انکار اور کیا ہوگا، یہ تو عیسائیوں اور یہودیوں نے بھی نہیں کیا، چنانچہ ابن تیمیہؒ نے بڑی عمدہ بات لکھی ہے، اور اس سے بہتر بات نہیں ہوسکتی اور میں اسی پر اپنی تقریر ختم کروں گا۔

ہم کس بھروسے پر غیروں کو دین کی دعوت دیں؟

وہ لکھتے ہیں کہ یہودیوں سے پوچھا گیا کہ تمہاری امت میں، امت یہودیہ میں سب سے افضل اور سب سے اعلیٰ لوگ کون تھے، انہوں نے جواب دیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی، عیسائیوں سے پوچھا کہ تم اپنی امت میں سب سے افضل اور سب سے بہتر کسے سمجھتے ہو، اور امت عیسوی میں نمونۂ کامل کون لوگ تھے، انہوں نے جواب دیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری، روافض سے پوچھا گیا کہ امت اسلامیہ میں سب سے بدتر اور خراب لوگ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی، بالکل الٹی بات۔

ارے بھائی جن کا یہ سب فیض ہے اور یہ جو آج روشنی نظر آرہی ہے بقول شاعر:

بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

اس کا فیض اگر اس کے قریب ترین لوگوں میں نہ پہنچے تو پھر کیسا دعویٰ اور میں نے تو کہا کہ اگر میں کسی مغرب ملک میں تقریر کر رہا ہوں اور تقریر زور وشور سے جاری ہو اور لوگ متاثرہ ہو رہے ہوں کہ ایک دم سے ایک عیسائی کھڑا ہوتا ہے اور مجھ کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ مولانا صاحب! یہ جو آپ ہم کو دین کی دعوت دے رہے ہیں تو آپ ہم سے کیا امید رکھتے ہیں، آپ کے نبی کے تیار کئے ہوئے لوگ آپ کے نبی کی آنکھ بند ہوتے ہی پھر گئے، تو پھر آپ ہم سے کیا امید رکھتے ہیں، اور ہم پر کیوں محنت کرتے ہیں، ہم اگر آج کلمہ بھی پڑھ لیتے ہیں، مسلمان بھی ہو جاتے ہیں، تو ہمارا کیا اعتبار، ہمارے پاس کوئی جواب نہیں، تو جب بقول اثنا عشری علماء کے تین ہی ارتداد سے بچے اور اسلام پر قائم رہے، ۲۳ سال کی محنت شاقہ اور مؤثر تربیت جو خاک کے ذروں کو کیمیا بنادے، اور سونا کیا چیز ہے، اس کو آسمان تک پہنچا دے، اس ۲۳ سالہ مشقت اور تبلیغ کے بعد نتیجہ صرف یہ ۳ را آدمی ہیں تو آپ ہم کو کس امید اور کس بھروسہ پر دین کی دعوت دے رہے ہیں؟

عظمت صحابہؓ اور محبت اہل بیت ہماری پہچان ہے:

آپ اس چیز کو ہمیشہ قائم رکھیں، صحابہ کرامؓ کو ہمیشہ قائم رکھیں، صحابہ کرامؓ کی عظمت وعقیدت، ان کی افضلیت کا عقیدہ، ان کی خلافت کو برحق ماننا، اور حضرات حسنین سیدنا حسن رضی اللہ اور سیدنا حسین رضی اللہ عنہ دونوں کے اقدام کو بالکل صحیح سمجھنا اور ان کے لئے دعائے خیر کرنا، اور ان سے محبت کرنا یہ ہمارا آپ کا شعار ہے، اور اس پر ہم کو فخر ہے، اور ہم اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ ہم اس پر زندہ رہیں، اور اسی پر دنیا سے جائیں۔

سو فی صدی مسلمان اور سراپا اسلامیت صحابہ کرام کا امتیازی وصف

اور فضائل و مناقب صحابہ سننے والوں کی ذمہ داری (۱)

الحمدالله وكفى سلام على عباده الذين اصطفى: أمابعد!

أعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم.

"يـا أيهـا الـذين آمنوا ادخلوا في السلم كافّة ولا تتبعوا خطوات الشيطٰن إنه لكم عدوّ مبين" (سورة البقرة: ۲۰۸).

برادران عزیز! اہل ایمان وحاضرین جلسہ!

میں نے آپ کے سامنے سورۂ بقرہ کی ایک آیت پڑھی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اسلام، میں داخل ہوجاؤ پورے پورے، اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو، بیشک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے)

آپ میں سے بہت سے لوگوں کو تعجب ہوگا کہ اس آیت کا انتخاب کیوں کیا گیا، اس

(۱) یہ تقریر ۱۲ محرم الحرام ۱۴۱۳ھ ہجری کو احاطۂ شوکت علی لکھنؤ مولانا عبدالشکور ہال میں جہاں یکم محرم الحرام سے ۱۵ محرم الحرام تک فضائل ومناقب صحابہ کرامؓ وخلفائے راشدینؓ کے عنوان پر علمائے کرام کی تقریریں ہوتی ہیں۔ ایک مجمع کثیر کے سامنے کی گئی۔

کا صحابہ کرام کے فضائل ومناقب سے کیا تعلق ہے، اس میں تو عام مسلمانوں سے خطاب ہے کہ اے مسلمانو! اسلام میں داخل ہو جاؤ سوفی صدی داخل ہو جاؤ، اور شیطان کی پیروی نہ کرو، اس لئے کہ وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

آپ نے صحابہؓ کے فضائل ومناقب کس مقصد اور کس نیت سے سنے؟

بے شک قرآن پاک کی ہر آیت برمحل ہے، ایمان افزا اور بصیرت افروز ہے، لیکن میں نے اس آیت کا انتخاب اس لئے کیا کہ میں اسی شہر [1] کا رہنے والا ہوں، اور اس ادارہ [2] سے میرا قریبی، محبانہ ونیاز مندانہ تعلق ہے، جو ان جلسوں [3] کا اہتمام کرتا ہے، مجھے معلوم ہے کہ آپ حضرات کئی دن سے صحابۂ کرامؓ کے فضائل ومناقب سن رہے ہیں، اور ان حضرات کی زبان سے سن رہے ہیں، جو ہر طرح ان فضائل کے بیان کرنے کے حامل ہیں، علمی حیثیت سے بھی اعتقادی حیثیت سے بھی، جذباتی حیثیت سے بھی، لیکن میرے دل میں کئی دن سے یہ خیال پیدا ہو رہا ہے، کہ صحابہ کرامؓ کے فضائل ومناقب آپ نے کن کانوں سے سنے، کس مقصد اور کس نیت سے سنے، آپ نے اپنی زندگی کا ان کی زندگی کے ساتھ تقابل کیا، اور آپ میں ان کی پیروی کا جذبہ پیدا ہوا؟ اسی لئے قصداً میں نے یہ آیت پڑھی۔

ایمان والوں سے مطالبہ ہے کہ کماً وکیفاً اسلام میں داخل ہوں!

اس آیت میں امت محمدیہ اور اس کے تمام افراد مخاطب ہیں، اگر صحیح اور مکمل نمونہ

(۱) لکھنؤ۔
(۲) دارالمبلغین لکھنؤ۔
(۳) شہدائے اسلام کے ۱۵ روزہ جلسے جو ایک صدی سے زائد عرصہ سے مسلسل منعقد ہو رہے ہیں۔

دیکھنا ہو تو صحابہ کرامؓ کی زندگی اور سیرت کا مطالعہ کرنا چاہئے، اس آیت میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ جنھوں نے اپنے ایمان کا اعلان کیا ہے اسلام میں سو فی صدی داخل ہو جائیں، **کماً** و **کیفاً**، جو لوگ عربی زبان سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ''کمیت'' کا تعلق نفوس سے ہوتا ہے، افراد سے ہوتا ہے، تعداد سے ہوتا ہے، اور ''کیفیت'' کا تعلق عمل سے ہوتا ہے، کیفیات وحالات اور اخلاق وعادات سے ہوتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اے ایمان والو! اسلام میں **کماً** و **کیفاً** صد فی صد داخل ہو جاؤ، یہ نہ ہو کہ مسلمانوں کی جماعت اور امت مسلمہ میں پچاس فی صدی تو پورے مسلمان ہیں اور پچاس فی صدی کے متعلق ہم نہیں کہہ سکتے اور ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے، یا ۷۵ فی صدی مسلمان ہیں اور ۲۵ فی صدی مسلمان نہیں ہیں، قرآن مجید، نبوت محمدی، تعلیمات اسلامی، اور آپ کی جدو جہد اور قربانیاں اور آپ کی صحبت کے برکات اور فیض نبوت اس کی اجازت نہیں دیتا کہ مسلمانوں میں بھی یہ تناسب رہے کہ اتنے فیصد پورے مذہب کے پابند ہیں اور اپنی مذہبی تعلیمات پر چلتے ہیں، اور اتنے فی صد نام کے مسلمان ہیں، مسلمانوں میں اس کی کوئی گنجائش نہیں، ان سے مطالبہ ہے کہ **کماً** یعنی تعداد افراد کے لحاظ سے بھی پورے کے پورے مسلمان ہوں اور **کیفاً** بھی۔

دین کن چیزوں کا مجموعہ ہے؟

دین کن چیزوں کا مجموعہ ہے؟ دین عقائد وعبادات، اخلاق وعادات، تہذیب ومعاشرت تعلقات ومعاملات، رسم ورواج ان سب کا مجموعہ ہے، اللہ تعالیٰ نے جو دین نازل کیا ہے، وہ ہماری زندگی کا پورا ضابطۂ حیات ہے، وہ پورا دستور العمل ہے، وہ ہماری زندگی کا پورا نقشہ بناتا ہے، ہماری زندگی کے سب خانے اس میں بھرے ہوئے ہیں، کوئی

خانہ خالی نہیں چھوڑا گیا، عقائد کا خانہ بھرا ہوا ہے، وہ ہے توحید خالص، ایمان بالرسالہ، ایمان بالآخرہ، عبادت کا خانہ بھرا ہوا ہے، پنج وقتہ نمازیں ہیں، زکوٰۃ ہے (اپنی تفصیلات کے ساتھ) روزہ ہے، حج ہے، اسلامی اخلاق وصفات کی بھی وضاحت کردی گئی ہے اور سیرت پاک اور اسوۂ حسنہ کی شکل میں ان کا اعلیٰ ترین نمونہ بھی محفوظ کردیا گیا ہے اور فرمادیا گیا ہے:

"إنك لعلى خلق عظيم" (سورة القلم: ٤)

آپ اعلیٰ اخلاق کے نمونہ ہیں۔

اور تعلیمات نبوی میں بھی وہ آگئے ہیں، اخلاق اسلامی کیا ہیں؟ صبر وتحمل ہے، اللہ کے راستہ میں فیاضی ہے، حیا ہے، نگاہوں کی حفاظت ہے، حال میں احتیاط ہے، معاملات میں صفائی ہے، گفتگو میں سچائی ہے، انسان کا احترام ہے، مسلمان کی محبت ہے۔

صحابہ کرامؓ کی پیروی کا جذبہ پیدا ہونا چاہیے:

صحابہ کرامؓ اس کا پورا نمونہ تھے، عقائد سے لے کر عبادات تک، عبادات سے لے کر اخلاق وعادات تک، اخلاق وعادات سے لے کر تہذیب ومعاشرت تک، پھر تہذیب ومعاشرت سے لے کر تعلقات ومعاملات تک، وہ سوفی صدی اپنے طرز زندگی کے لحاظ سے بھی مسلمان تھے، صحابہ کرامؓ کے تذکرہ کی مجلس میں شریک ہوکر صحابہ کرامؓ کے فضائل ومناقب سن کر ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوجاتی ہے کہ ہم ان کی پیروی کی کوشش کریں، آپ یہاں اس لئے نہیں آتے ہیں کہ یہاں آپ دل چسپ واقعات سنیں گے، اور اپنی معلومات میں اضافہ کریں گے، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ صحابہ کرامؓ کی محبت وعقیدت میں اضافہ ہوجائے تو یہ بھی بڑی مبارک بات ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی

ضروری ہے کہ آپ کے اندر ان کی پیروی کا اور ان کی زندگی کو اپنے لئے نمونہ بنانے کا جذبہ پیدا ہو۔

صحابہ کرامؓ پورے پورے مسلمان تھے:

صحابہ کرامؓ کلیۃً اپنی تعداد کے لحاظ سے بھی، اپنے مزاج کے لحاظ سے بھی، اپنے طرز زندگی کے لحاظ سے بھی، اپنے اخلاق وخصائل کے لحاظ سے بھی اور عادات ورسم ورواج کے لحاظ سے بھی، ہر طرح سے مکمل مسلمان تھے، ان کے یہاں ان میں کسی قسم کا استثناء نہیں تھا، اسلام ایک مستقل تہذیب بھی ہے، طرز معاشرت بھی ہے، ضابطۂ حیات بھی ہے، عائلی قانون اور دستور بھی ہے، اس میں تعلقات ومعاملات کے خاص ضوابط واصول ہیں، صحابہ کرامؓ ان سب پہلوؤں سے مکمل مسلمان اور تعلیمات اسلامی کے پیرو تھے، ان کا معاملہ یہ تھا کہ ان کی ایک زندگی ختم ہو کر دوسری زندگی شروع ہوئی تھی، سانچہ میں ڈھل کر جیسے کوئی چیز نکلتی ہو، اور اگر یہ تشبیہ بے جا نہ ہو تو میں کہوں کہ سانچہ میں سے جس طرح ڈھلا ہوا سکہ نکلتا ہے، اپنے رقبہ کے ساتھ اپنے طول وعرض کے ساتھ، اپنے پورے نقوش کے ساتھ وہ بالکل ڈھلا ہوا ہوگا، یہ صحابہ کرامؓ کی زندگی تھی کہ اس میں کسی قسم کا استثناء نہیں تھا، عقائد سے لے کر رسم ورواج اور تہذیب ومعاشرت تک وہ پورے پورے بدل چکے تھے، اور ان کے پہلے عہد (جاہلیت) کی کسی چیز کا سایہ ان پر باقی نہیں رہا تھا۔ میں جرأت کر کے (علی وجہ البصیرۃ) آپ سے کہتا ہوں کہ ملل واقوام کی تاریخ، بلکہ انبیائے کرام کی امتوں کی تاریخ میں، ایسے انقلاب حال، ایسی جامعیت کی مثال ملنی مشکل ہے، میں صحابہ کرامؓ میں سے، (خلفائے راشدین) کے چار واقعات اس حالت

اور زمانہ کے بیان کروں گا، جب وہ حاکمانہ حیثیت میں تھے، اور ان کو پورے اختیارات حاصل تھے اور دو واقعات ان صحابیوں کے (اطاعت و ایثار بے نفسی اور خدا ترسی کے) اس وقت کے بیان کروں گا جب وہ اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے، اور اپنی عزت نفس کے لئے بہت کچھ کر سکتے تھے، لیکن انہوں نے ایسے ایثار، بے نفسی اور قربانی کا مظاہرہ کیا جس کی نظیر تاریخ قدیم وجدید میں بھی ملنی مشکل ہے۔

پھر میں بتاؤں گا کہ معاشرت وتہذیب میں ان میں جاہلیت اولیٰ اور جاہلیت عربیہ کا نہیں، بلکہ جاہلیت حاضرہ، رومی تہذیب اور ساسانی تہذیب کا سایہ بھی نہیں پڑا تھا، اس کی بھی چند مثالیں دوں گا۔

خلیفۃ المسلمین کا حال:

آپ جانتے ہیں کہ حکومت کتنا بڑا امتحان ہے، آدمی جب حاکم ہو جاتا ہے، تخت سلطنت پر بیٹھتا ہے، آپ اس کا نام خلافت رکھئے، وہ بھی ایک طرح کی فرماں روائی تھی اسے کم سے کم اپنے ذاتی معاملات اور خانگی زندگی میں مکمل اختیارات حاصل ہوتے ہیں، جو چاہے کھائے، پہنے پہنائے، جس طرح کی چاہے سواری رکھے، جو چاہے اپنے اوپر خرچ کرے، میں یہ چار واقعات آپ کے سامنے بیان کرتا ہوں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا واقعہ ہے کہ ان کی اہلیہ محترمہ نے ان سے ایک دن کہا کہ امیر المؤمنین بیت المال سے ہم کو جو روزینہ (روز کا خرچ) ملتا ہے وہ مشکل سے اتنا ہوتا ہے، کہ سادہ سے سادہ کھانے کا انتظام کر لیا جائے، بچوں میں سے کوئی بھوکا نہ رہے، لیکن اس میں کچھ ذائقہ بدلنے اور منہ میٹھا کرنے کی گنجائش نہیں ہے، اس میں کچھ درہموں

(عرب کا چھوٹا سکہ) کا اضافہ کر دیا جائے، تو ان بچوں کا بھی منہ میٹھا ہو، یہ معصوم کچھ کہہ نہیں سکتے، لیکن ان کا حق ہے کہ کبھی ان کا منہ میٹھا کیا جائے، اس لے آپ ہمارے لئے اس کا کچھ انتظام کریں۔

حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ مسلمانوں کا بیت المال اس لئے نہیں ہے کہ خلیفۃ المسلمین (جس پر خلافت کی ذمہ داری ہے) یا اس کے گھر کے بچوں کا منہ میٹھا کیا جائے، اس کی مسلمانوں کے بیت المال میں گنجائش نہیں!

نماز معاف کرانے گئے تھے روزے گلے پڑ گئے:

آپ خیال کیجئے کہ جہاں قیصر و کسریٰ کے ملکوں کا خراج آتا تھا، اور مفتوحہ ممالک کی دولت امنڈ کر آرہی تھی، اس بیت المال کے متعلق فرماتے ہیں کہ گنجائش نہیں کہ ابوبکرؓ کے بچوں کا منہ میٹھا کیا جائے اور گھر میں مٹھائی کا سامان مہیا کیا جائے، حضرت ابوبکرؓ کی اہلیہ بڑی عاقلہ تھیں، کہنے لگیں کہ پھر اجازت دیجئے کہ اس روزینہ میں سے کچھ بچالیا کریں، اور اس سے بازار سے کچھ سامان منگوالیں، اور کچھ مٹھائی بنوالیں، حضرت ابوبکرؓ نے کہا اسے میں کیسے روک سکتا ہوں، یہ تو تمہاری سلیقہ مندی کی بات ہے، بیوی صاحبہ نے اس روزینہ میں سے ایک ایک درہم دو دو درہم بچانے شروع کئے، جو سامان وہ منگواتی تھیں، اس میں سے کچھ کم کر کے اتنا ہو گیا کہ میٹھا تیار ہو سکے، یہ رقم انہوں نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ میں رکھی، حضرت ابوبکرؓ نے بجائے بازار سے سامان لانے کے وہ پیسے بیت المال میں داخل کر دئے اور اس کے ذمہ دار سے فرمایا کہ تجربہ نے یہ ثابت کر دیا کہ ابوبکر کے گھر کا گزارہ اس سے کم پیسوں میں ہو سکتا ہے، ہماری اہلیہ نے ثابت کر دیا کہ اتنے پیسے کم ملیں

گے جب بھی کوئی بھوکا نہیں رہے گا، اس لئے اب ہمیں اسے لینے کا حق نہیں، اسے بیت المال میں داخل کردو، جیسے ہمارے لکھنؤ کی زبان میں کہاوت ہے، کہ نماز معاف کرانے گئے تھے روزے گلے پڑ گئے، بجائے میٹھے کے سامان ہونے کے روزانہ کے خرچ میں اور کمی کردی گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مشورہ پر عمل:

حضرت عمر فاروقؓ کا واقعہ سنئے آپ نے بیت المقدس کا سفر کیا، عیسائیوں، یہودیوں نے شرط لگا دی تھی کہ ہم بیت المقدس کا چارج براہ راست خلیفۃ المسلمین کو دیں گے، اس واقعہ کو پورے طور پر سنانے سے پہلے آپ کو ایک دوسری بات بھی سنادوں، جس سے آپ صحابہ کرامؓ کے آپس کے تعلقات اور خاص طور پر سیدنا علی مرتضیٰؓ اور فاروق اعظمؓ اور دیگر خلفائے راشدین کے درمیان اخلاص، خیر خواہی اور اعزاز و اکرام کا جو معاملہ تھا وہ سمجھ سکیں، جس کے بارے میں بہت کچھ غلط فہمی پیدا کی گئی ہے۔

ایک مرتبہ عراق و ایران میں اسلامی افواج کے قائد اعظم حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے اس بات کی درخواست کی کہ امیر المؤمنین حضرت فاروق اعظمؓ یہاں آجائیں، ایرانی افواج کا اجتماع ہو رہا ہے، اور فیصلہ کن جنگ کی تیاری ہو رہی ہے، امیر المؤمنین آجائیں گے تو اس کا اچھا اثر پڑے گا، مخالفین پر رعب طاری ہوگا، ہم لوگوں کو اطمینان ہوگا، بعض صحابہ کرامؓ نے اس کی تائید کی اور خود بھی جانے کے لئے تیار ہوئے، لیکن سیدنا علی مرتضیٰؓ نے اس کی مخالفت کی، کہا کہ امیر المؤمنین کو جانے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ کی مدد پر اعتماد کیجئے، امیر المؤمنین، خلیفۃ المسلمین، ایسی سستی اور معمولی چیز نہیں ہیں کہ محاذ

جنگ پر خود چلے جایا کریں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے ان کا مشورہ قبول کیا، اور تشریف نہیں لے گئے۔

مسجد اقصیٰ کی چابی امیر المومنین ہی کے حوالہ کریں گے:

اب یہ دوسرا موقع آیا تھا کہ فلسطین کے حاکموں اور مسجد اقصیٰ کے متولیوں نے آپ کو شہر اقدس میں آنے کی دعوت دی، اور کہا کہ ہم آپ ہی کو بیت المقدس کی چابی حوالہ کریں گے، اب آپ حضرت علی مرتضیٰؓ کے اخلاص اور حضرت عمر امیر المؤمنین سے تعلق کا اندازہ کیجئے، اور دونوں واقعات کا مقابلہ کیجئے، کہ جب آپ کو عراق آنے کی دعوت دی گئی تھی، تو حضرت علیؓ نے ہاتھ پکڑ لیا تھا کہ نہیں جانے دیں گے، اللہ پر اعتماد کیجئے انشاء اللہ فتح ہوگی، لیکن جب یہودیوں، عیسائیوں نے شرط کی کہ ہم اس وقت مسجد اقصیٰ کی چابی حوالہ کریں گے، جب خود امیر المؤمنین یہاں آئیں گے، تو سب سے پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے تائید کی اور کہا کہ یہ بڑے اعزاز کی بات ہے، بیت المقدس کو اپنے تحویل میں لینا اور اس کا ذریعہ بننا کہ وہ مسلمانوں کے انتظام اور تولیت میں رہے بڑی سعادت اور اعزاز کی بات ہے، آپ ضرور جائیں، میں کہتا ہوں کہ یہی ایک بات حضرت علی مرتضیٰؓ اور فاروق اعظمؓ کے درمیان اخلاص و تعلق ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔

سفر شام کا حال:

اب اس سفر کا حال سنئے جو حضرت عمرؓ خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے شام کا کر رہے ہیں، یہ وہ فاروق اعظمؓ ہیں کہ اگر ان کا نام قریب کے ملکوں کے فرماں رواؤں اور فوجی افسروں کے سامنے لیا جاتا تو شاید ان کو رات کو نیند نہ آتی، وہ اس شان سے مدینہ سے چلے

کہ اونٹ ان کی سواری میں تھا، اس پر ایک چادر پڑی ہوئی تھی، ایک چادر ان کے ساتھ تھی، وہی ان کا بچھونا تھا، گرمی، لو وغیرہ سے بچنا ہوتو وہی منہ پر ڈال لیتے، ایک غلام ساتھ تھا، کبھی وہ آگے ہو جاتا تو لوگ سمجھتے کہ امیر المؤمنین یہی ہیں، اس شان سے آپ نے سفر کیا، بیت المقدس کے قریب راستہ میں ایک دریا پڑا، وہ دریا میں گھس گئے، کُھل کُھل کرتے ہوئے جا رہے تھے، قائد افواج اسلامی حضرت ابوعبیدہؓ سے رہا نہیں گیا، انھوں نے کہا کہ امیر المؤمنین! لوگوں کی نگاہیں آپ پر ہیں، اور وہ دیکھ رہے ہیں کہ خلیفۃ المسلمین کس شان سے آئے ہیں، حضرت عمرؓ نے اس پر فرمایا کہ ابوعبیدہ! یہ بات کوئی اور کہتا تو استعجاب نہ ہوتا، ہم دنیا میں سب سے ذلیل انسان تھے، اللہ نے اسلام کے ذریعہ ہم کو عزت بخشی، اب اگر ہم اسلام کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے عزت طلب کریں گے، تو اللہ ہمیں ذلیل کر دے گا۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہ اور ان کے ساتھیوں کے جسم پر اچھا لباس دیکھا اور شام اس وقت کی دنیا میں تہذیب اور دولت کے لحاظ سے نقطۂ عروج پر تھا، آپ نے فرمایا کہ اے ابوعبیدہؓ! تم لوگ اتنی جلدی بدل گئے، یہاں آکر ایسا (امیرانہ) لباس پہنے ہوئے ہو، حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا کہ امیر المؤمنین! اس کے نیچے ویسے ہی لباس ہے جو ہم پہنتے ہیں، یہ سرد ملک ہے اس لئے ہم اس کے اوپر پہنے ہوئے ہیں، الحمد اللہ ہمارے اخلاق وعادات نہیں بدلے، یہ تھی حضرت عمرؓ کی شان اور یہ تھی صحابہ کرامؓ کی شان۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا عجیب حال:

حضرت عثمان غنیؓ اغنیائے صحابہ میں تھے، وہ مکہ معظمہ کے دولت مندوں میں بھی

تھے اور مدینہ طیبہ کے دولت مندوں میں بھی، اونٹوں کا پورا پورا قافلہ انھوں نے جہاد کے لئے مہیا کردیا ہے، اور بئر رومہ (مدینہ طیبہ کا مشہور کنواں) جس کے بیچنے والے یہودیوں نے بڑے دام لگائے تھے، تنہا انہوں نے خرید کر وقف کردیا۔

ان کے متعلق مؤرخین نے لکھا ہے کہ وہ گھر میں روکھا سوکھا کھا کر رہتے، لیکن جب مہمان و وفود آتے تو انھیں امیرانہ کھانا کھلاتے اور خود وہی روکھا سوکھا کھا کر گذارا کرتے، حاکم ہونے کی حالت میں بھی ان کے زہد وتقویٰ کا وہی حال تھا۔

ستو سے مہمان نوازی:

حضرت علی مرتضیٰ کے حالات میں لکھا ہے کہ آپ نے ایک صاحب کو دوپہر کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی، وہ خوش ہوئے کہ آج امیر المؤمنین کے ساتھ کھانا کھانا ہوگا، آپ نے مٹی کی ایک ہانڈی طلب کی جو وہاں رکھی تھی، جب ان کے سامنے آئی تو اس پر مہر لگی تھی، جب آپ نے اس کی مہر توڑی تو اس میں صرف ستو تھا، آپ نے اس میں سے تھوڑا نکالا اس پر پانی ڈالا خود پیا اور مجھے بھی پلایا، مجھ سے رہا نہ گیا، میں نے کہا امیر المؤمنین! آپ عراق میں رہ کر یہ کھاتے ہیں، یہاں کے عوام کا کھانا بھی اس سے کہیں بہتر ہوتا ہے، فرمایا واللہ میں اس کو مہر بند بخل کی وجہ سے نہیں رکھتا، بات یہ ہے کہ میں اسی قدر خریدتا ہوں جتنی ضرورت ہو، اور ڈرتا ہوں کہ یہ اگر ختم ہوجائے تو دوسرے مال سے ستو بنادیا جائے، اس لئے اس کی اتنی حفاظت کرتا ہوں، میں پسند نہیں کرتا کہ میرے پیٹ میں سوائے حلال اور پاک چیز کے کچھ جائے۔

یہ چار مثالیں میں نے آپ کے سامنے پیش کیں، یہ تھیں خلفاء کی مثالیں جو بہرحال

خلافت کی خصوصیات اور آداب کے ساتھ ایک بڑی مملکت کے حاکم وفرماں روا بھی تھے۔ اب میں دو واقعے دو صحابیوں کے ایثار واطاعت و بےنفسی کے پیش کرتا ہوں جو محکوم کے ساتھ بجائے خود قائد وصاحب اقتدار بھی تھے۔

آپ جانتے ہیں کہ دنیا میں آدمی سب کچھ برداشت کرلیتا ہے، لیکن جس سے اس کی ہیٹی ہوتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ اس سے میری توہین ہوئی، وہ نہیں برداشت کرسکتا، بڑے زاہدوں اور بڑے بڑے درویشوں کے لئے بھی یہ ایک بڑا مجاہدہ ہے، اب آپ یہ دو واقعے سنئے:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی للّٰہیت:

حضرت خالد بن ولیدؓ کی شان کیا تھی؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سیف اللہ (اللہ کی تلوار) کا لقب دیا تھا، حالت یہ تھی کہ جس مہم پر حضرت خالد بن ولیدؓ ہوں اور جس لشکر کی قیادت وہ کریں، بس گویا اس کی تقدیر میں فتح لکھی ہوئی ہے، فاتح ان کے نام کا مرادف بن گیا تھا، اور گویا وہ دونوں لازم وملزوم تھے۔

شام میں یرموک کی جنگ ہونے والی ہے، شام کی جنگوں میں بلکہ اسلام کی ابتدائی تاریخ میں ایسی جنگ نہیں ہوئی، حضرت خالد سپہ سالار اعظم (کمانڈر انچیف) ہیں، سب کو اطمینان، عین اس وقت جب اسلامی فوجیں ان کی طرف جانے والی تھیں اور معرکہ ہونے والا تھا، عین اس وقت مدینہ طیبہ سے قاصد آتا ہے، اور کہتا ہے کہ امیر المؤمنین کا خط لایا ہوں، خط میں یہ تھا کہ ہم نے خالد کو معزول کیا، اور ابوعبیدہؓ کو سپہ سالار بنایا، اب آپ بتایئے کہ کیا دنیا میں اس کی مثال ملنی آسان ہے؟ کہ اس موقع پر وہ شخص جس نے درجنوں

مصر کے سر کیے اور ہر موقع پر فتح اس کے حصہ میں آئی، اور جس کی دشمنوں پر دھاک بیٹھی ہوئی تھی، وہ اس میں توہین محسوس نہ کرے، اور اس فیصلہ کے آگے سر تسلیم خم کردے، لیکن ان کی پیشانی پر شکن بھی نہیں آئی لوگ عالم حیرت میں تھے انھوں نے پوچھا کیا آپ اب بھی جنگ میں حصہ لیں گے، اور اسی جوش وعزم واطمینان کے ساتھ کام کریں گے؟ حضرت خالدؓ نے فرمایا کہ اگر میں عمرؓ کے لئے لڑتا تھا تو اب نہیں لڑوں گا اور اگر اللہ کے لیے لڑتا تھا (جہاد فی سبیل اللہ کرتا تھا) تو اب بھی راہ خدا میں اسی طرح لڑوں گا، چنانچہ انھوں نے دکھا دیا کہ وہ اللہ کے لئے لڑتے تھے، وہ اسی جوش وخروش کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لیتے تھے، اور اسی حالت میں دنیا سے گئے۔

حضرت عمرو بن العاصؓ کی بے نفسی:

اب دوسرا واقعہ حضرت عمرو بن العاصؓ کا سن لیجئے، وہ مصر کے فاتح بھی تھے، اور وہاں کے گورنر اور نائب السلطنت اور منتظم اعلیٰ بھی، ہزار سادگی، اور قناعت ہو حاکم کا بہر حال ایک رعب اور فرق ہوتا ہے، ایک مرتبہ گھوڑ دوڑ ریس ہو رہی تھی اس میں ان کے بیٹے بھی شریک تھے، وہ عربی گھوڑے پر سوار تھے، ایک مصری قبطی بھی گھوڑا دوڑا رہا تھا، اس کا گھوڑا آگے نکلا جا رہا تھا، حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے نے کوڑا اٹھایا اور کہا: **خذها من ابن الأكرمين** (پشتینی شریف زادہ کے ہاتھ سے کوڑا کھا) جب اسے کوڑا پڑا تو حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے کا گھوڑا آگے ہو گیا، اس قبطی نے حضرت عمرؓ سے شکایت کردی انھوں نے حضرت عمرو بن العاصؓ کو بھی بلایا اور ان کے بیٹے کو بھی طلب کیا اور اس قبطی کو بھی بلایا، قبطی سے کہا کہ کوڑا لو اور ابن الاکرمین (پشتینی شریف زادہ) کے سر پر سے

پھراڈااوراس کے بعد حضرت عمرو بن العاصؓ سے کہا"من متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا؟ تم نے کب سے ان اللہ کے بندوں کوغلام بنالیا جب کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے تھے، وہ قبطی مسلمان بھی نہ تھا، عیسائی تھا، یہ تھا عدل فاروقی اور یہ تھا فاتح وحاکم مصر (حضرت عمرو بن العاصؓ) کا ایثار، بے نفسی، اور قربانی، انہوں نے نہ استعفیٰ دیا، نہ یہ کہا کہ اب میں مصر کیا منہ لے کر جاؤں گا، جب کہ میرے بیٹے کے مقابلے میں ایک قبطی کو ترجیح دی گئی۔

ایرانی تاجدار کی حالت!

اب میں آپ کو ایک دوسری خصوصیت اور تاریخی نکتہ کی طرف توجہ دلاؤں گا، وہ یہ کہ ایک بڑی سخت آزمائش یہ تھی کہ ان صحرانشین، جفاکش وفاقہ مست عربوں کے ایک طرف رومی تہذیب تھی تو دوسری طرف ایرانی تہذیب تھی، آپ تاریخ کی کتابوں میں پڑھیں کہ رومیوں کی تہذیب کہاں تک پہنچ گئی تھی، اور ایرانیوں کی تہذیب بلندی کے کس نکتہ کو چھو رہی تھی، جہاں تک ایران کا تعلق ہے، اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ جیسا اسلامی فتوحات کے نتیجہ میں ایران کا آخری تاجدار یزدگرد اپنے دارالحکومت مدائن سے فرار ہوا تو اس حالت میں بھی اس کے ساتھ ایک ہزار باورچی، ایک ہزار مغنی، ایک ہزار چیتوں کے منتظم، اور ایک ہزار لشکروں کی دیکھ بھال کرنے والے، اور خدم وحشم اور مصاحبین کی ایک بڑی تعداد تھی، اتنے بڑے لاؤلشکر کے باوجود بھی وہ اس تعداد کو کم اور خود کو ایک معمولی اور حقیر پناہ گزیں سمجھتا تھا۔

یہ تو سربراہ حکومت کا حال تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ امراء میں سے کسی کا

ایک لاکھ درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا، اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور کھانے میں تکلفات اور لباس وپوشاک میں تجمل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی۔

صحابہؓ رومی وایرانی تہذیب سے پاک تھے:

ان دونوں تہذیبوں سے نہ صرف گھرے ہوئے اور ان کے قصے سنے ہوئے اور ان کے آثار دیکھے ہوئے ہی نہیں، بلکہ ان کے ممالک ووسائل پر قابض اور متصرف ہونے کے باوجود صحابہ کرامؓ، فاتحین اسلام، اور ان صحرا نشین عربوں کی جفاکشی، سادگی، ان کے اتباع سنت کے ذوق اور ان کی اسلامی عربی تہذیب کی خصوصیات میں فرق نہیں آیا، نہ ان میں عیش وتجمل، آرائش وزیب وزینت کا ذوق اور تعیش پیدا ہونے پایا، نہ رومیوں، ایرانیوں کے معاشرہ کی آزادی وبے حیائی اور طبقۂ نسواں میں بے پردگی رومی وایرانی تہذیب کی نقالی، فرمائشوں کی کثرت، اسراف کی عادت اور شادیوں اور تقریبات میں اظہار شان وشوکت کے مناظر دیکھنے میں آئے مسلمانوں کو صرف دینی وسیاسی تاریخ پڑھنے ہی سے نہیں، ان کی ادبی وتمدنی کتابوں کے مطالعے سے بھی ایسے واقعات وشواہد نہیں ملتے، کہ کم سے کم دور صحابہؓ اور عہد خلافت راشدہ میں مفتوح رومی وایرانی تہذیب نے تمدنی طور پر فاتح کا کردار ادا کیا ہو، اور وہی معیار عزت وشرافت بن گئی ہو، اس کو ایک چھوٹی سی مثال اس وقت ذہن میں آئی ہے، حضرت سلمان فارسیؓ جو ایرانی النسل کے تھے جب وہ عراق کے گورنر بنا کے بھیجے گئے، تو ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ ان کے ہاتھ میں کھانے کی کوئی چیز تھی وہ ہاتھ سے گر گئی، خیال کیجیے وہ گورنر ہیں، ایرانی النسل ہیں اور لوگ ان کے گرد وپیش ہیں، انھوں نے اس چیز

کو اٹھایا، جھاڑا اور منہ میں رکھ لیا، ایک شخص نے (جو غالبًا ایرانی ہوگا) کہا عالی جناب آپ نے ایسی بات کی ہے جو آپ کے شایان شان نہ تھی، حضرت سلمانؓ نے اس کے جواب میں جو فرمایا اور جو لفظ نقل کیا گیا ہے اس سے ان کا ذہن، کردار اور طریقۂ فکر معلوم ہوتا ہے، انھوں نے فرمایا:

أ أترك سنة حبيبي لأحمق مثلك

کیا میں اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو تجھ جیسے احمق کی خاطر چھوڑ دوں۔

یہ تھا صحابہؓ کا کردار:

یہ تھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا معیار کہ انھوں نے اسلام کو صرف عقائد کے دائرہ ہی میں محدود نہیں سمجھا بلکہ تہذیب و معاشرت کا سانچہ بنانے والا معاملات و تعلقات کے حدود متعین کرنے والا، زندگی گزارنے کا طریقہ طے کرنے والا بھی سمجھا، وہ ان کا مزاج بن گیا، سیرت بدل گئی، اسلام کے آنے کے بعد جاہلیت عربیہ کے اثر و نفوذ سے نکلے، پھر رومی و ایرانی تہذیب اور ان ترقی یافتہ جاہلیتوں کا بھی کوئی اثر اپنے اوپر پڑنے نہیں دیا۔

ہمارے لئے لمحۂ فکریہ!

ایک ہم آپ ہیں، ہم ہندوستان میں آئے اور یہاں کے باشندوں نے بھی اسلام قبول کیا، کسی نے ہم پر دباؤ نہیں ڈالا، ہم بڑی تعداد میں بھی تھے، اور یہاں ہم نے آٹھ سو برس تک حکومت بھی کی، لیکن ہم نے ہم وطن و ہمسایہ قوموں کی تہذیب کو کس درجہ میں قبول کرلیا ہے، یہ شادیوں اور باراتوں کی شان و شوکت اور دھوم دھام کہاں سے آئی؟ جہیز کے بڑھے چڑھے مطالبے کہاں سے آئے؟ ہماری زندگی میں (اور خاص طور پر) کھاتے پیتے

اور ترقی یافتہ معاشرہ میں وہ پہلی سی سادگی کہاں ہے، حدود شرعیہ کی کہاں تک حفاظت ہوتی ہے، حلال وحرام کا کتنا فرق ملحوظ ہے، نمود وفرمائش سے چاہے اس میں منکرات شرعیہ کا ارتکاب کیا جائے کتنا گریز اور اجتناب ہے؟

صحابہؓ کی سادگی:

ایک طرف ہماری تقریبات کا یہ حال ہے کہ دور دور کے شہروں اور بعض اوقات ملک کے باہر تک دعوت نامے بھیجے جاتے ہیں اور ان دعوت ناموں پر بھی سیکڑوں روپے صرف ہوتے ہیں، دوسری طرف صحابہ کرامؓ کی سادگی، اور طرز زندگی کا خاص طور پر ایسی مسرت کی تقریبات میں ایک ہی نمونہ سن لیجئے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ مدینہ طیبہ میں جہاں وہ قریبی زمانہ میں مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے آئے تھے، ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے دیکھا کہ ان کے کپڑوں پر خوشبو کا نشان ہے، آپ نے فرمایا عبدالرحمٰنؓ خیریت ہے؟ آج یہ نشان کیسا ہے؟ انھوں نے بلا کسی معذرت اور شرمندگی سے کہا، یارسول اللہ میں نے آج نکاح کیا ہے، اس موقع پر یہ خوشبو لگائی، آپ نے ایک لفظ بھی شکایت اور گلہ کا نہیں فرمایا، کہ عبدالرحمٰن اتنی جلدی تم مدینہ میں آ کر ہم کو بھول گئے اور تم نے تعلقات کا لحاظ نہیں کیا، ہمیں نہ خبر کی نہ بلایا، فرمایا تو اتنا فرمایا، کہ ولیمہ ضرور کرنا، چاہے ایک ہی بکری کا ہو، ایک ہمارے یہاں کی تقریبات ہیں کہ سارے شہر میں دھوم مچ جاتی ہے، اور محلّہ میں تو بھونچال آ جاتا ہے، ایسے واقعات ہمارے علم میں ہیں کہ ایک ایک شادی میں پچاس پچاس لاکھ روپے صرف ہوئے، ہزاروں سینکڑوں کا تو پوچھنا ہی نہیں۔

میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ صحابہ کرامؓ کے فضائل ومناقب سننے کی بڑی ذمہ داری ہے۔

کل قیامت کے دن آپ سے پوچھا جاسکتا ہے کہ تم نے ان واقعات سے کیا سبق لیا، صحابہ کرامؓ کی زندگی تو ایسی بدل گئی تھی کہ ضلالت کا کوئی نشان باقی نہیں رہا تھا، اسلام اور جاہلیت میں کیا فرق ہے؟ اور ان کا کیا مفہوم ہے؟ اسلام ہے، خدا چاہی زندگی، جاہلیت ہے، من مانی زندگی'' اب ان دونوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہے اور اس آیت کا جو میں نے شروع میں پڑھی یہی مفہوم اور تقاضا ہے کہ اسلام کو پورے شعبوں، گوشوں اور دائروں کے ساتھ قبول کیا جائے، اور اس کی تعلیمات پر پورے طور پر کاربند ہوا جائے۔

يـا أيهـا الـذيـن آمنوا ادخلوا في السلم كافة ولا تتبعوا خطوات الشيطٰن، إنه لكم عدو مبين.

اے ایمان والو! اسلام میں مکمل طور پر داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو بے شک وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے۔

مسلمانوں کے لئے ایک اہم پیغام

۱۵؍محرم الحرام ۱۴۱۳ھ (۸؍جولائی) کو دار المبلغین کے ماتحت ہونے والے ان جلسوں کو جو شہدائے اسلام کی یادگار ہیں مولانا عبد الشکور ہال احاطہ شوکت علی لکھنؤ میں راقم نے بھی اپنی شدید مصروفیتوں اور بعض پریشانیوں اور افکار کے باوجود شرکت کی سعادت حاصل کی اور وہاں ایک تقریر کے ذریعہ حالات حاضرہ سے متعلق مسلمانوں کو ایک پیغام دیا، جو قابل نقل و اشاعت ہے، اور اپنے اندر خاص معنویت اور اہمیت رکھتا ہے، اس کا خلاصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے[1]:

''اپنے خطاب میں شہدائے اسلام کے جلسوں کی عظمت اور ان کے بانی مولانا عبد الشکور صاحب مرحوم کے خلوص کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ یکم محرم سے اب تک ان جلسوں میں جن علمائے کرام نے بیانات کئے ہیں، میرے دل میں ان تمام بیانات اور خطابات کی بڑی قدر ہے، میں آپ کو صرف اس وقت ایک ایسا پیغام دینا چاہتا ہوں کہ جو آپ کی زندگیوں میں انقلاب اور معاشرہ میں تبدیلی پیدا کر سکے، میں اپنی حاضری کا اپنے اوپر یہ حق سمجھتا ہوں کہ آپ کے سامنے کوئی رہنما اصول پیش کروں۔

---

(۱) از مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی۔

میں ایک تجربہ کار سیاح اور تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے کہنا چاہتا ہوں کہ انبیاء علیہم السلام کو چھوڑ کر سب سے بڑا تاریخ ساز، انقلاب انگیز، عہد آفریں فقرہ جس نے ایک نئی تاریخ کی بنیاد ڈالی ذہنوں میں انقلاب برپا کیا، ہزاروں مصلحین، مفکرین، فلاسفر اور عظیم ترین انسان پیدا کئے، پوری ادبیاتِ عالم میں اور ادیان ومذاہب کی تاریخ میں اور معاشرہ پر اثر ڈالنے والے جملوں کی فہرست میں کسی نے اتنا اثر نہیں ڈالا جتنا صدیق اکبرؓ کے جملے "أَيُنْقَصُ الدِّينُ وَأَنَا حَيٌّ" (میرے جیتے جی دین میں کمی ہو؟) نے اعتقادی، ذہنی، فکری اور عملی اعتبار سے اسلامی تاریخ میں ڈالا، یہی وہ کلمہ ہے جو دل کی ترجمانی کرنے والا، اور لوحِ دل پر نقش کرنے کے لائق ہے، اللہ نے صدیق اکبرؓ کو دین کی بقا وحفاظت کے لئے پیدا فرمایا تھا، اگر آپؓ عزیمت اور استقامت سے کام نہ لیتے تو دین اسلام کی بقا خطرہ میں تھی، آج منکرینِ زکاۃ نے اسلام کے ایک رکن پر حملہ کیا تھا، کل آہستہ آہستہ دوسرے ارکانِ اسلام پر حملہ کیا جاتا، دیگر مذاہب وادیان کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب ترمیم وتحریف کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے تو پھر وہ نہیں رکتا، یقیناً صدیق اکبرؓ کا یہ قیمتی اور وزنی فقرہ شاعروں کے دیوان اور اسلامی ادبیات میں اپنا ممتاز مقام رکھتا ہے۔

سلسلۂ تقریر جاری رکھتے ہوئے حاضرین کو اس طرف توجہ دلائی گئی کہ اس وقت ملک میں مسلمانوں کے ملی تشخص، دینی عقائد اور اسلامی شعائر کے خلاف منصوبے تیار ہو رہے ہیں، زبان، اور رسم الخط کو بدلنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، پورے ملک میں یکساں سول کوڈ کے لئے راہیں بنائی جارہی ہیں، اگر آپ RSS اور شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے کی کتابیں پڑھیں تو ان تمام سازشوں کا پتہ چلے گا، نہایت ذہانت، غور وفکر اور

قانونی دانش مندی کے ساتھ ایسا نقشہ بنایا جارہا ہے کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلیں زبان، لباس کے اعتبار سے بالکل مختلف ہوں، اس لئے ہمیں اپنی ملی تشخص کی حفاظت کے لئے نعرۂ صدیقی کو اپنا منشور بنانا چاہیے، گھر لُٹ جائے، جان چلی جائے، مگر ایمان نہ جائے، بھو کے رہ جائیں، مگر نماز نہ چھوٹے، آپ اپنے گھر کے ماحول میں تبدیلی پیدا کریں، انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرت اور صحابہ کرامؓ کے واقعات اپنے بچوں کو سنائیں، اور ان میں اپنے دین پر قائم رہنے اور اس کے لئے ہر طرح کا ایثار اور خطرہ مول لینے کی ہمت وعزیمت پیدا کریں، اور اسلام وایمان پر فخر کرنا سکھائیں اور کفر وشرک اور دوسروں کی نقالی سے نفرت ودحشت پیدا کریں، سیرت نبوی، صحابۂ کرام کے کارناموں اور اپنی قدیم تاریخ سے واقف ہوں"۔

راقم کی تقریر کے بعد مولانا قاری محمد صدیق صاحب باندوی نے جو صلحائے وقت اور علمائے کبار میں ہیں مختصر تقریر کی جس میں راقم کی تقریر کی تائید میں چند جملے کہے اور دعا پر جلسہ کا اختتام کیا۔[1]

[1] کاروان زندگی، جلد ۵، ص: ۲۰۴-۲۰۶۔

ان سے ٹوٹا رفض کا کبر وغرور (۱)

از: حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ

مرد حق مرد خدا مرد غیور   خاصۂ خاصان حق عبد الشکور
نور عین حضرت عین القضاۃ (۲)   جان جان اہل دل اہل حضور
نائب بو احمد (۳) وعبد السلام (۴)   جن سے پھیلا علم کا، عرفاں کا نور
صاحب علم و عمل زہد و ورع   صاحب جذب دروں عقل وشعور

---

(۱) حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ (۱۹۲۵ء-۱۹۸۲ء) کی پیدائش اپنے آبائی وطن دائرۂ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں ہوئی، مکتبی تعلیم گھر پر حاصل کی، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے، تعلیم کی تکمیل جامعہ مظاہر علوم سہارنپور سے فرمائی، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کاندھلویؒ سے بے انتہا تعلق تھا، اور زیادہ سے زیادہ وقت انہیں کی خدمت میں گزرتا تھا، اور ان سے آپ کو اجازت بھی حاصل تھی، آپ ایک بہترین عالم اور زبردست شاعر تھے، للٰہیت رگ وریشہ میں بسی تھی، جس کی شہادت آپ کے متعدد رفقائے درس اور متعلقین نے دی ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے حقیقی بھانجے اور مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے برادر اکبر تھے، اور مرتب کے پرنانا تھے۔ **رحمه الله وجعل الجنة مثواه.**

(۲) حضرت مولانا شاہ عین القضاۃؒ بانی مدرسہ فرقانیہ لکھنؤ۔

(۳) حضرت مولانا شاہ ابواحمدؒ مجددی بھوپالی۔

(۴) حضرت مولانا شاہ عبدالسلام ہنسویؒ۔

ان کی ضرب موسوی نے کردیا — رفض و شیعیت کا کاسہ چور چور
لکھنؤ میں ان سے سرسبز و نہال — سنت و توحید کا ہے نخل طور
جس پہ کرتے تھے نگاہ التفات — شرک و بدعت سے وہ ہوتا تھا نفور
آج جو ہے مدح اصحاب نبی — ہے انہیں کی خیر و برکت کا ظہور
ان کا علم و فضل تھا مانا ہوا — شہرت ان کے زہد کی ہے دور دور
ہیں امام اہل سنت بالیقیں — ان سے ٹوٹا رفض کا کبر و غرور
بے شک ان کی صحبت پاکیزہ بھی — باعث تسکین قلب نا صبور
ان کی تقریروں نے تصنیفات نے — کر دیا ایمان کا پیدا شعور
ان کی عظمت کو نہ سمجھیں گے کبھی — بے خدا بے دین و بے عقل و شعور
معترف ہے ان کی عظمت کا وہی — جس کے دل میں ہے بسا ایماں کا نور
میں دعا اللہ سے کرتا ہوں یہ — ہو منور مرقد عبد الشکور
اپنی رحمت کی فراوانی کرے — مالک دنیا و دیں رب غفور

دے جزا بہتر جزا ان کو خدا
سرخرو ان کو کرے یوم النشور [1]

---

[1] میزاب رحمت، ص: ۲۰۰۔